آزادی سے جمہوریت تک
۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے تناظر میں
مولانا ندیم الواجدی
دار الکتاب دیوبند

آزادی سے جمہوریت تک

۱۵ر اگست اور ۲۶ر جنوری کے تناظر میں

مولانا ندیم الواجدی

دار الکتاب دیوبند

تفصیلات

نام کتاب..............: آزادی سے جمہوریت تک
۱۵/ اگست اور ۲۶/ جنوری کے تناظر میں

نام مصنف...............: مولانا ندیم الواجدی

طبع اوّل..............: ۱۴۳۸ھ/۲۰۱۷ء

صفحات.................: ۱۲۸

کمپیوٹر کتابت ....: محمد مستقیم سالک قاسمی مدھوبنی
یاسر ندیم کمپیوٹرس دیوبند

مطبع....................: یاسر ندیم آفسیٹ پریس دیوبند

باہتمام..................: واصف حسین مالک دارالکتاب دیوبند

ناشر.....................: دارالکتاب دیوبند

فہرست مضامین

دارالعلوم دیو بند کے قیام کا مقصد

''حضرۃ الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

تعلیم و تعلم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے، جس کے لیے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرۃ الاستاذ نے قائم کیا تھا''

ارشاد حضرت شیخ الہند دیو بندیؒ، ناقل حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

(احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: ۱۷۰، ۱۷۱)

پیش لفظ

انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جنگ آزادی تقریباً دو سو برس تک جاری رہی، اس دوران متعدد تحریکوں نے جنم لیا، ایک تحریک ختم ہوگئی تو دوسری نے اس کی جگہ لے لی، یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا، یہاں تک کہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کی نصف رات کو وطن عزیز لیلائے آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوا، یہ نعمت ہمیں یونہی حاصل نہیں ہوگئی، اس کے حصول کے لیے ہمارے بزرگوں نے اپنا لہو بہایا ہے، اور یہ لہو ایک دو دن نہیں، ایک دو مہینے یا ایک دو سال تک نہیں بہا بلکہ دو صدیوں تک بہتا رہا ہے، ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ نے اپنے لہو سے حصول آزادی کی جو مشعل روشن کی تھی وہ ملک بھر میں برسوں گردش کرتی رہی، کبھی یہ مشعل ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں رہی اور کبھی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اسے روشن رکھا، کبھی حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اسے قریہ قریہ بستی بستی اٹھائے پھرتے رہے، کبھی یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں نے تھامی، کبھی اس میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کے خون سے روشنی رہی، ان بزرگوں کی قیادت میں ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، گولیاں کھائیں، پھانسیوں پر لٹکے، کتنے ہی لوگوں نے زندگی کے ماہ و سال قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے، جلاوطن ہوئے، اس داستان آزادی کا ہر حرف اور ہر لفظ ہمارے بزرگوں کے خون شہادت سے رنگین ہے۔

آزادی ملی تو یہ سوال ہوا کہ اب اس ملک کو کس رُخ پر چلنا ہے، مطلق العنانیت اور جبر و استبداد کی طرف یا انصاف اور مساوات کی طرف، اس وقت کے سیاسی لیڈروں اور حکومتی نمائندوں نے اتفاق رائے کے ساتھ طے کیا کہ اب شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کا دور ختم ہو چکا ہے، آزادی کی صبح طلوع ہو چکی ہے، یہ ملک اب جبر و استبداد کی تیرگی کے بجائے جمہوریت کی روشنی میں سفر کرے گا، اس طرح ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک اور نعمت ملی وہ ہے اس ملک میں جمہوریت کی نعمت۔

یہ دو دن ۱۵/ اگست اور ۲۶/ جنوری ہمارے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ۱۵/ اگست کو آزادی ملی، اور ۲۶/ جنوری کو جمہوریت، پورے **ملک میں یہ دونوں دن**

ہر سال بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منائے جاتے ہیں، منانا بھی چاہیے کیوں کہ اس طرح کی تقریبات سے ان لوگوں کی یاد زندہ ہوتی ہے جنھوں نے ہماری آزادی کے لیے خود کو قید وبند کے حوالے کیا، ان میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے انگریزوں کی گولیاں کھائیں اور آزادی کے لیے جام شہادت نوش کیا۔

یہ میرے چند مضامین ہیں جو میں نے آزادی اور جمہوریت کے تناظر میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، خیال ہوا کہ ان کو ایک مجموعے کی شکل دے دی جائے، اس کا داعیہ یوں پیدا ہوا کہ ہر سال ۱۵/اگست اور ۲۶/جنوری کی آمد کے موقع پر ہمارے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ چاہتے ہیں کہ انھیں ایسی کوئی مختصر کتاب مل جائے جس میں آزادی اور جمہوریت کا ذکر ہوتا کہ وہ ان دونوں موقعوں پر منعقد ہونے والے اجتماعات میں اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکیں، مضامین تو اور بھی تھے، لیکن ایک تو ان کی شمولیت سے ضخامت میں اضافہ ہوتا دوسرے ان میں کوئی نئی بات بھی محسوس نہیں کی گئی، جو کچھ ان مضامین میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے وہی باتیں ان مضامین میں کہیں اختصار سے کہیں تفصیل سے الفاظ اور انداز بیان کی تبدیلی سے پیش کی گئی ہیں، اس لیے میں نے انھی چند مضامین کو کتاب میں شامل کرنا مناسب سمجھا، ویسے بھی یہ مضامین آزادی اور جمہوریت کے تقریباً تمام قابل ذکر پہلوؤں کا احاطہ کر رہے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ مدارس کے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام اُردو داں حضرات بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے، ان مضامین کو پڑھنے کے بعد انہیں آزادی کے صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا، اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانیں گے کہ آج ہم آزاد فضاؤں میں جو سانس لے رہے ہیں وہ ان لاکھوں جانبازوں کی رہین منت ہے، جنھوں نے غلام بن کر زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دی، صرف اس لیے کہ ان کی اس قربانی سے آنے والی نسلوں کو آزادی ملے گی، یہ چھوٹی سی کتاب ایسے ہی لاکھوں جانباز شہیدان وطن اور اسیران وطن کی نذر ہے۔

مخلص
ندیم الواجدی
مدیر ماہ نامہ ''ترجمان دیوبند''
۳/جنوری ۲۰۱۷ء

اسلام میں آزادی کی قدر و قیمت

اسلام دین فطرت ہے، اور آزادی انسان کا فطری اور بنیادی حق ہے، اسلام سے پہلے انسان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، پوری دنیا دو گروہوں میں منقسم تھی کچھ لوگ وہ تھے جو تمام تر وسائل زندگی پر قابض ہونے کی وجہ سے مضبوط اور مستحکم پوزیشن میں تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار اور بالادستی ان کا پیدائشی حق ہے باقی لوگ صرف محکومیت اور اطاعت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، دوسرے گروہ کے لوگ اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے مگر کم زوری اور بے حسی نے ان کو ذہنی اور جسمانی طور پر غلام بنا کر رکھ دیا تھا، نہ انہیں فکر وخیال کی آزادی میسر تھی اور نہ عقیدہ و مذہب کی، نہ انہیں کسب معاش کا حق تھا اور نہ انہیں کسی چیز کے مالکانہ حقوق حاصل تھے جس میں وہ اپنی مرضی سے تصرف کر سکتے، یہ لوگ بہ ظاہر انسان تھے مگر انسانیت کے حوالے سے جو احترام اور مرتبہ و مقام انہیں حاصل ہونا چاہیے تھا اس سے بالکلیہ محروم تھے، ان حالات میں اسلام آیا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور انسانیت کو یہ مژدہ سنایا گیا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (۱)

ترجمہ: ''اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں''۔

دیکھا جائے تو اسلام کی آمد ان دبے کچلے لوگوں کے لیے مژدۂ جاں فزا تھی جو صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، ان ہی جیسے کچھ لوگ بالادست تھے، جو اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ جس طرح چاہتے پیش آتے، کسی میں دم مارنے کی

(۱) الاعراف: ۱۵۷.

جراٗت نہ تھی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ایسے لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے روشناس ہونے کا موقع ملا جسے آزادی کہتے ہیں، آزادی بھی انہیں اپنے مفہوم کی تمام تر وسعتوں کے ساتھ میسر آئی، اس میں جان و مال کی آزادی بھی تھی، فکر و خیال کی آزادی بھی تھی، مذہب و عقیدے کی آزادی بھی تھی، شخصی اور نجی زندگی کی آزادی بھی تھی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کی آزادی بھی تھی۔

سب سے پہلے تو آپ انسان کی جان کو لیجئے، اس سے زیادہ بیش قیمت کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، اسلام سے پہلے اس کی کوئی قیمت نہیں تھی، اگر تھی تو صرف ان لوگوں کی جان بیش قیمت تھی جو اقتصادی اور سیاسی طور سے مضبوط تھے اور جن کے پیچھے خاندانی نظام کی طاقت تھی، باقی لوگ حشرات الارض کی طرح حقیر تھے، جو چاہتا انہیں پاؤں تلے کچل دیتا، اسلام نے یہ اعلان کرکے ہر ذی نفس کو زندہ رہنے کی آزادی سے نوازا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (۱)

ترجمہ: ''جو شخص کسی ایسی جان کو قتل کرے جس نے قتل نہ کیا ہو اور نہ اس نے روئے زمین پر فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اور جو کسی انسانی زندگی کی بقا کا سبب بنا تو اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی''۔

انسانی جان کے تحفظ اور بقا کا یہ اعلان تمام انسانوں کے لیے ہے، اس میں کسی مسلم غیر مسلم اپنے پرائے کی تخصیص نہیں ہے، انسان کو زندہ رہنے کی جو آزادی عطا کی گئی ہے اس کے تحفظ کے لیے اسلامی شریعت میں قصاص کا ایک مکمل نظام ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ہر قیمت پر اس آزادی کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور اگر کوئی شخص دنیوی سزا کے اس نظام سے بچ بھی جائے تو اس کے لیے اخروی عذاب کی اس قدر ہولناک وعیدیں ہیں کہ ان کی موجودگی میں کوئی سلیم الفطرت شخص کسی کی یہ آزادی سلب کرنے کی جراٗت کر ہی نہیں سکتا، پھر جان کی آزادی صرف یہ ہی نہیں کہ وہ زندہ رہے مگر اسے کسی

(۱) المائدة: ۳۲.

طرح کا کوئی حق حاصل نہ ہو، نہ وہ کوئی اختیار رکھتا ہو، اسی لیے اسے حقوق و اختیارات بھی دیئے گئے تاکہ وہ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکے، جان کے بعد اگر کسی کو کوئی چیز عزیز ہوتی ہے تو وہ مال و دولت ہے، اسلام انسان کو مال کمانے کی اجازت بھی دیتا ہے اور اس میں تصرف کرنے کی آزادی بھی عطا کرتا ہے، بہ شرطیکہ یہ کسب و انفاق جائز حدود کے اندر ہو، اس میں بھی مرد و عورت حاکم و محکوم کی کوئی قید نہیں ہے، ہر شخص اس کے لیے آزاد ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ. (۱)

ترجمہ: ''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں جو وہ کمائیں''۔

اسلام نے نہ صرف یہ کہ انسان کو جسمانی آزادی دی بلکہ دوسری نوع کی آزادیوں سے بھی نوازا، اس کو عزت و وقار عطا کیا، عدل و انصاف کے تقاضوں میں مساویانہ حقوق دیئے، اظہار خیال کی آزادی عطا کی، صرف احرار ہی کو نہیں بلکہ غلاموں کو بھی ان حقوق میں شریک کیا، ایک روایت میں ہے کہ حضرت بریرہؓ کو آزادی ملی تو انہیں شریعت کی طرف سے خود بہ خود یہ اختیار مل گیا کہ وہ اپنے شوہر حضرت مغیثؓ کی زوجیت میں رہیں یا اس رشتے کو ختم کردیں، انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ مغیثؓ کے نکاح میں نہیں رہیں گی، حضرت مغیثؓ یہ رشتہ باقی رکھنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی درخواست کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم مغیثؓ کی زوجیت میں رہو حضرت بریرہؓ نے عرض کیا کہ یہ آپ کا حکم ہے یا رسول اللہ! فرمایا نہیں! بلکہ سفارش ہے، عرض کیا پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، اظہار خیال کی آزادی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہوسکتی ہے کہ ایک شخص نے بر سر منبر خطبہ دیتے ہوئے حضرت عمر فاروق اعظمؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ کو یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم آپ کا خطبہ اس وقت تک نہیں سنیں گے اور آپ کی اطاعت اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک آپ اس

(۱) النساء: ۳۲.

کپڑے کے متعلق صحیح بات نہیں بتلائیں گے جو آپ کے بدن پر ہے، ایک بوڑھی عورت نے حضرت عمرؓ کو سر راہ روک کر کہا کہ اے عمرؓ وہ دن یاد کرو جب عکاظ کے بازار میں لوگ تمھیں عمیر کہا کرتے تھے، کچھ دنوں کے بعد لوگ عمرؓ کہنے لگے اور اب تم امیر المؤمنین ہو، خدا سے ڈر کر کام کرنا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی فطرت کے اس پہلو کی ہمیشہ رعایت کی ہے اور صحابۂ کرامؓ کو اظہار خیال کا پورا پورا موقع عنایت فرمایا ہے، بعض انتظامی امور میں صحابۂ کرامؓ منصب نبوت کا احترام ملحوظ رکھ کر مشورے دیا کرتے تھے، اور وہ مشورے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں قبول بھی کئے جاتے تھے، غزوۂ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کرنا چاہئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا، اسی طرح غزوۂ بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا گیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ان کو زر فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا، تاہم اسلام میں اظہار رائے کی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی پر لعن طعن کیا جائے، کسی کی توہین کی جائے، اظہار رائے ہو مگر حدود وقیود کے ساتھ ہو، بڑوں کی تعظیم بھی ملحوظ رہے، حکام کا وقار بھی باقی رہے آج جس اظہار رائے کا شور ہے وہ اسلام کی نظر میں مستحسن نہیں ہے، کیوں کہ اس میں اپنی رائے کا اظہار مقصود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی توہین اور دلآزاری مقصود ہوتی ہے اسلام کو تو یہ بھی گوارا نہیں کہ اظہار رائے کا حوالہ دے کر معبودان باطلہ کو برا کہا جائے حالاں کہ یہ براہِ راست مقامِ الوہیت کے خلاف بغاوت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَاتَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ. (۱) ''اور برا مت کہو ان کو جن کی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں''۔

اسی سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اسلام انسان کو مذہبی آزادی بھی عطا کرتا ہے حالاں کہ اسلام کے خلاف روز اول سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہ دین تلوار کے زور

(۱) الانعام: ۱۰۸.

سے پھیلا ہے، اور مسلمانوں نے بہ جبر و اکراہ دوسروں کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کیا ہے، یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے، پوری اسلامی تاریخ میں زبردستی کی کوئی مثال نہیں ملتی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اسلام سے روکنے کے لیے ضرور زبردستی کی گئی ہے، جو لوگ اسلام کے دامن میں پناہ لے چکے تھے، یا پناہ لینا چاہتے تھے، انہیں وحشت ناک اذیتیں دی گئیں اور ان پر سخت ترین تشدد کیا گیا، تاریخ کی کتابیں اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہیں، اس کے برعکس اسلام انسان کے لئے مذہبی آزادی کے حق کو تسلیم کرتا ہے اور اس سلسلے میں وسعت ظرفی اور فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ: لَاإِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. (۱) ''دین کے سلسلے میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے ہدایت گمراہی کے مقابلے میں قطعاً واضح ہو چکی ہے''۔

ایک جگہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا. اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوا مُؤْمِنِیْنَ. (۲)

ترجمہ: ''اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگ مسلمان ہو جاتے کیا آپ ایمان قبول کرنے کے لیے لوگوں پر زبردستی کریں گے''۔

ایک جگہ یہ مضمون ان الفاظ میں آیا ہے۔ فَذَکِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ. لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ. (۳) ''آپ نصیحت کیجئے، آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان کے اوپر مسلط نہیں ہیں''۔

ایک اور آزادی جس کا ہم بہ طور خاص ذکر کریں گے وہ انسان کی نجی زندگی کی آزادی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو آزادی اور خود مختاری عطا کی ہے وہ اپنے بود و باش میں، رہن سہن میں، بول چال میں، طرزِ معاش میں، طرزِ معاشرت میں، شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے مکمل طور پر آزاد ہے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ فرد کے ان کے حقوق میں کسی

(۱) البقرة: ۳٤. (۲) یونس: ۹۹. (۳) الغاشیة: ۲۱. ۲۲.

طرح کی مداخلت کرے، اسی لیے تانک جھانک سے، تجسس سے، عیب جوئی سے، غیبت سے اور افشائے راز سے منع کیا گیا ہے کہ ان چیزوں سے فرد کی خودمختاری اور نجی زندگی پر ضرب پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ آزادی اس قدر عزیز ہے کہ اس نے مسلمانوں کو حکم دیا:

لَاتَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا. (۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والوتم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک ان سے اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو''۔

اسی مضمون میں ہم نے حضرت بریرہؓ اور حضرت مغیثؓ کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں حضرات ابتدائے اسلام میں غلام تھے، غلامی کا ذکر آیا تو یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اسلام پر مغربی دنیا کی طرف سے برابر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ اس نے غلامی کی رسم بد جاری رکھی، یہ الزام محض تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہے، مغرب کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ نہ اسے اسلام کی انسان دوستی اور انسانیت نوازی گوارا ہے اور نہ اس کی جامعیت اور آفاقیت برداشت ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں جب کہ بنیادی طور پر اسلام نے غلامی کی بدعت ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے غلامی اپنی تمام تر قباحتوں کے ساتھ معاشرے میں موجود تھی، یہ اور بات ہے کہ اسلام نے تمام برائیوں کی طرح اس برائی کو بھی ایک دم ختم نہیں کیا، کیوں کہ اس سے معاشرے میں دوسرے مسائل پیدا ہو سکتے تھے بلکہ اپنے وصف اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھ کر ترغیب و تحریض کے ذریعے اس خرابی کو اس طرح مٹایا کہ آج غلامی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

اسلام کی آمد سے پہلے غلاموں کی باقاعدہ تجارت ہوتی تھی، معاشی اقتصادی، زرعی، صنعتی اور نجی ضرورتوں کے لیے ان کا وجود ناگزیر تھا، غلاموں کے باقاعدہ بازار

(۱) النور: ۲۷.

تھے، جہاں اشیائے ضروریہ کی طرح ان کو فروخت کے لیے رکھا جاتا تھا قرآن کریم میں پیغمبر خدا حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ ان کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈال دیا تھا، تاجروں کا ایک گروہ مصر جانے کے ارادے سے کنویں کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کنویں کے اندر ایک حسین و جمیل بچہ موجود ہے، تاجروں نے اس بچے کو جو حضرت یوسفؑ تھے کنویں سے نکالا اور مصر پہنچ کر بازارِ غلاماں میں فروخت کر دیا، اس زمانے کی متمدن کہلائی جانے والی قومیں ان غلاموں کو نہ صرف یہ کہ محنت طلب کاموں میں لگاتیں بلکہ ان کا جنسی طور پر بھی استحصال کرتیں، دولت مند اور اصحاب اقتدار ان غلاموں پر نشانہ بازی کی مشق کرتے، اور انہیں بھوکے شیروں کا لقمہ بنتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے، ان کو جنگوں میں استعمال کیا جاتا، تلواروں اور نیزوں کے مقابلے میں اتارا جاتا، ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا، ان کو پیٹ بھر کھانے اور تن ڈھانپنے کے لیے ضروری کپڑوں سے محروم رکھا جاتا، معاشرے میں غلاموں کی اس قدر کثرت تھی کہ بعض مال دار لوگ سینکڑوں غلاموں کے مالک تھے، یہ لوگ اپنے غلاموں کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرتے، خود ہی فیصلے کرتے خود ہی سزا دیتے، ظالمانہ سلوک کے لیے کوئی ان سے باز پرس تک نہیں کرسکتا تھا۔

اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی تعلیمات سے انقلاب برپا کیا ہے، کوئی اخلاقی پستی اور غیر انسانی برائی ایسی نہیں ہے جس کو اسلام نے اپنے قوانین کے تدریجی ارتقاء کے ذریعے ختم نہ کیا ہو، غلامی کا مسئلہ بھی بڑا سنگین تھا، اسلام نے روز اول سے اس کی سنگینی محسوس کی، وہ چاہتا تو یک لخت اس سلسلے کو منقطع کر دیتا، اور مالکان کو پابند کرتا کہ وہ بلا تاخیر اپنے غلام باندی آزاد کر دیں، مگر اس نے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی اپنی مخصوص حکمت عملی سے کام لیا، اپنے مزاج اور لوگوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر اس نے وہ طریقہ اختیار کیا جس سے لوگ خود بہ خود غلاموں کی آزادی کی طرف مائل ہو جائیں، اور آزاد نہ کرسکیں تو کم از کم ان کے ساتھ وہ سلوک تو کریں جس کے وہ بہ حیثیت انسان مستحق ہیں، قرآن کریم نے واضح طور پر تمام انسانوں کی برابری کا

جھوٹی قسم کے کفارے میں بھی فرمایا گیا کہ یا تو دس مساکین کو کھانا کھلا دیا انہیں کپڑا دے دو یا ایک غلام آزاد کرو:

فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ.(۱)

معاملہ اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ قرآن کریم میں مالکان کو یہ ترغیب بھی دی گئی ہے کہ وہ غلاموں کی رہائی میں مالی تعاون کریں۔ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰكُمْ.(۲) اور اگر ان میں خیر کا پہلو دیکھیں تو انہیں مکاتب بنا دیں یعنی انہیں اختیار دے دیں کہ وہ اپنی رہائی کی قیمت ادا کر کے رہائی حاصل کر لیں۔ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا.(۳) یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر غلاموں کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی کہ وہ اپنی رہائی کی تدبیر کر سکیں اور مال ادا کر کے رہائی حاصل کر سکیں، قرآن کریم نے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ انہیں مصارف زکوۃ میں سے ایک مصرف قرار دے کر ان کے لیے رہائی کی سبیل پیدا کی(۴) اسلام نے تو یہاں تک حکم دیا کہ اگر کوئی شخص آزاد مسلمان عورت سے نکاح نہ کر سکے تو اپنی مملوکہ باندیوں سے نکاح کر لے۔ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ.(۵)

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام حریت کا علمبردار ہے اور وہ استحصال کی ہر شکل کا مخالف ہے، غلامی استحصال کی سب سے مکروہ شکل ہے، اسلام نے آزاد مسلمانوں اور غلاموں میں اخوت کا رشتہ استوار کیا ''تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں''(۶) ان میں مساوات قائم کی، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ انسانی مساوات کی بہترین تعلیم ہے، اسلام نے غلاموں کے لیے بھی عدل وانصاف کے وہی پیمانے رکھے جو آزاد انسانوں کے لیے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کریں گے اور جس نے اپنے غلام کے اعضاء کاٹے ہم اس کے

(۱) المائدہ: ۸۹.(۲) النور: ۳۳. (۳) النور: ۳۳. (٤) التوبہ: ٦٠. (۵)النساء: ۲۵.(٦) ترمذی شریف: ۱٦/۲.

اعضاء کاٹیں گے۔(۱) اسلام نے غلاموں کو وہ شرف بخشا ہے آج کا ''مہذب'' معاشرہ جس کا تصور نہیں بھی کر سکتا، اور اس شرف کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ.(۲) ''بلاشبہ اللہ کے یہاں زیادہ متقی ہی زیادہ شرف والا ہے''۔

صحابۂ کرامؓ نے قرآن کریم کی اس تعلیم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، حضرت عمر فاروقؓ باوجودیکہ خلیفۃ المسلمین تھے حضرت بلال حبشیؓ کو جو قبول اسلام کے بعد تک غلام رہے یا سید بلال کہہ کر آواز دیا کرتے تھے، یہ احترام زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں تھا، بلکہ صحابۂ کرامؓ کے مزاجوں میں پوری طرح رچ بس گیا تھا، غلامی کے حوالے سے کوئی تفریق ہی نہیں کی جاتی تھی، غلاموں اور لونڈیوں سے شادی بیاہ کے رشتے قائم کیے جاتے تھے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ سے کر کے غلاموں کو احترام کے ساتھ اپنانے کی طرف پہلا قدم بڑھایا اور صحابہ کرامؓ نے اس کی تقلید کی، بہت سے اجلہ صحابۂ کرامؓ نے غلاموں کو اخوت کی ڈور میں باندھا، حضرت زیدؓ اور حضرت حمزہؓ، حضرت خارجہ ابن اسدؓ اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت خالد بن رویحہؓ اسی رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ قیادتیں اور سیادتیں غلاموں کے سپرد کی گئیں حضرت زید بن حارثہؓ اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسامہ بن زیدؓ لشکر اسلام کے امیر مقرر کیے گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے کبار صحابہؓ نے ان کی قیادت میں جنگ لڑی، کیا اس مساوات کا کوئی نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے؟

(۱) ترمذی شریف: ۱٦۹/۱. (۲) الحجرات: ۱۳

علماء کے خون سے رنگین داستان آزادی

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوا، یہ ایک غلط مفروضہ ہے جو جان بوجھ کر عام کیا گیا ہے تاکہ ۱۸۵۷ء سے سو برس پہلے جس تحریک کا آغاز ہوا اور جس کے نتیجے میں بنگال کے سراج الدولہ نے ۱۷۵۷ء میں، مجنوں شاہ نے ۱۷۷۶ء اور ۱۷۸۰ء میں، حیدر علی نے ۱۷۶۷ء میں، اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے ۱۷۹۱ء میں، مولوی شریعت اللہ اور ان کے بیٹے دادو میاں نے ۱۸۱۲ء میں اور سید احمد شہیدؒ نے ۱۸۳۱ء میں انگریزوں کے خلاف جو باقاعدہ جنگیں لڑیں وہ سب تاریخ کے غبار میں دب جائیں، اور اہل وطن یہ نہ جان سکیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی چنگاری اس دن سے سلگ رہی تھی جس دن انہوں نے اپنے ناپاک قدم اس سرزمین پر رکھے تھے اور تجارت کے نام پر سیاسی اور فوجی اثر و رسوخ حاصل کر کے یہاں کے حکمرانوں کو بے دست و پا کر دیا تھا، سو سال تک مسلمان پوری طاقت اور قوت کے ساتھ اپنے علماء کی قیادت میں ان سے نبرد آزما رہے، یہاں تک کہ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو تحریک آزادی کی جدوجہد کا دوسرا دور شروع ہوا اور غیر مسلم اہل وطن نے بھی جدوجہد آزادی میں اپنی شرکت درج کرائی۔

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی قیادت میں پرتگال کے ملاحوں نے سب سے پہلے سرزمین ہند کو اپنے ناپاک قدموں سے آلودہ کیا اور صوبہ بنگال کے شہر کلکتہ اور جنوبی ہند کے شہر کالی کٹ کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، یہ لوگ تجارت کے مقصد سے وارد ہوئے تھے مگر مذہب کی اشاعت میں بھی سرگرم ہو گئے، اس وقت ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا

تھا، اس ملک میں تجارت کے بے شمار مواقع تھے، مالی ترقی کے وسیع تر امکانات نے انگلستان کے تاجروں کو بھی ادھر متوجہ کیا، انہوں نے تیس ہزار پاؤنڈ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی اور ۱۶۰۱ء میں پہلی مرتبہ اس کمپنی کے تجارتی جہاز ہندوستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے، ۱۶۱۲ء میں جہانگیر کے عہد حکومت میں ان انگریز تاجروں نے شہنشاہ کی اجازت سے گجرات کے شہر سورت میں اپنا اقتصادی مرکز بنالیا اور بہت جلد اس کی شاخیں احمد آباد، اجمیر، برہان پور اور آگرہ میں قائم کردیں، یہ شہر اس زمانے میں تجارت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے تھے، اور بڑے تجارتی مراکز میں شمار کئے جاتے تھے، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت تک انگریزوں کی سرگرمیاں صرف تجارت تک محدود رہیں، اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ حکومت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا یہاں تک کہ احمد شاہ کے دور حکومت (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۲ء) میں یہ ملک طوائف الملوکی کا شکار ہوگیا، بہت سے صوبوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا، ایسٹ انڈیا کمپنی جواب تک صرف ایک تجارتی کمپنی تھی ملک گیری کی ہوس میں مبتلا ہوگئی اور اس نے اپنی سیاسی قوت بڑھانی شروع کردی یہاں تک کہ اس نے کلکتے میں اپنا ایک مضبوط فوجی قلعہ بھی تیار کرلیا۔

سراج الدولہ پہلا شخص ہے جس نے اس خطرے کو محسوس کیا اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کی کوشش کے طور پر پلاسی کے میدان میں ان سے جنگ کی، اگر سراج الدولہ کا وزیر میر جعفر غداری نہ کرتا تو انگریز دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہوجاتے، اس غدار وطن کی وجہ سے سراج الدولہ کو شکست حاصل ہوئی، انعام کے طور پر میر جعفر کو بنگال کا اقتدار ملا، لیکن اس کا اقتدار زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا، کچھ دنوں بعد وہ معزول کردیا گیا، اس کا داماد میر قاسم برسر اقتدار آیا، انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ بھی دیر تک اقتدار پر قابض نہ رہ سکا یہاں تک کہ انگریز ۱۷۶۴ء میں بہار اور بنگال پر قابض ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اودھ تک پھیل گئے، مغل حکمراں شاہ عالم نے سند دیوانی دے کر ان کے قبضے کی توثیق کردی، ایک معاہدے کی رو سے ان پر ۲۶/ لاکھ روپے سالانہ زر مال گزاری ضروری

قرار دیا گیا، ابتدا میں ان کے اختیارات زر مال گزاری کی وصولیابی تک محدود تھے جو بڑھتے بڑھتے داخلی نظم ونسق تک تجاوز کر گئے، مغلوں کی حکومت قلعہ معلّٰی تک محدود ہو کر رہ گئی اور ہندوستان کے تمام علاقے عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے تابع بن گئے۔

یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کے علاوہ ایران وافغانستان سے تعلق رکھنے والے دوسرے حکمراں بھی ہندوستان کو اپنے زیرنگیں کرنے کے لیے حملہ آور ہوئے ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے دہلی کو تباہ وبرباد کیا، اور ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے دو ماہ تک مسلسل اس شہر کو یرغمال بنائے رکھا، دوسری طرف انگریز فوجیں مرہٹوں سے ٹکراتی ہوئیں، سراج الدولہ کو شکست دیتی ہوئیں اور سلطان ٹیپو کو جامِ شہادت پلاتی ہوئیں دہلی کی طرف بڑھ رہی تھیں، ابھی انگریزوں نے پوری طرح دہلی کا اقتدار حاصل بھی نہیں کیا تھا کہ علماء ہند کے میر کارواں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) نے مستقبل کے خطرات کا ادراک کر لیا، اور دہلی پر قبضے سے پچاس برس پہلے ہی اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ اس وقت طویل قیام کے ارادے سے مکہ مکرمہ میں تھے کہ کشف والہام اور رویائے صادقہ کے ذریعے انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ ہندوستان جائیں ۱۷۳۰ء میں مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران حضرت شاہ صاحب محدث دہلویؒ نے ترکی نظام حکومت کا بہ غور مطالعہ کیا، یورپ افریقہ اور ایشیاء سے آنے والے حجاج کرام سے ان کے ملکی قومی اور سیاسی معاملات پر تبادلۂ خیال کیا، طویل غور وخوض اور تبادلۂ خیال کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی تباہی، بربادی اور تنزلی کا واحد سبب وہ نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ "فک کل نظام" (ہر نظام کو ختم کرنے) کی طرف قدم بڑھایا جائے، یہ نظریہ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے انقلابی نصب العین کا نقطۂ آغاز ہے، اس کی پاداش میں آپ پر جان لیوا حملے بھی کئے گئے لیکن آپ اپنے نظریے پر ڈٹے رہے، انہوں نے اپنی کتابوں میں، خطوط میں، تقریروں میں یہ نظریہ اس طرح پیش کیا، "تباہ حال شہر جس پر درندہ صفت انسانوں کا تسلط ہو جن کو

اپنی حفاظت ودفاع کی پوری طاقت حاصل ہو، یہ ظالم وجابر گروہ جو انسانیت کے لیے سرطان ہے، انسان اس وقت تک صحت مند نہیں ہو سکتا جب تک اس سرطان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے۔(۱)

"تفہیمات الٰہیہ" حضرت شاہ ولی اللہ کی معرکۃ الآراء کتاب ہے، اس میں وہ خطوط موجود ہیں جو ذمہ داران حکومت اور والیان ریاست کو وقتاً فوقتاً تحریر کیے گئے اور ان کے ذریعے ان اسباب کی نشان دہی کی گئی جن سے ملک اور قوم کو خطرات لاحق ہوئے، ان اسباب کے تدارک کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے کیا لائحہ عمل تیار کیا اس کی تفصیلات جاننے کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ کی اہم ترین عربی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس کی کتاب الجہاد سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ جہاد اسلامی کے اصولوں پر مبنی فوجی حکمت عملی سے انقلاب لانا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ایسے رجال کار تیار کئے جائیں جن میں اس نصب العین کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ہو اور اسے عملی جامہ پہنانے کی طاقت اور ہمت بھی، ایسے افراد کی تیاری کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے متعدد جگہوں پر فوجی تربیت کے لیے باقاعدہ مراکز قائم کئے۔

دہلی، رائے بریلی، نجیب آباد، ٹھٹھہ سندھ اور لکھنؤ چند ایسے مقامات ہیں جہاں نوجوانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کیا جاتا تھا اور انہیں آنے والے انقلاب کے لیے تیار کیا جاتا تھا، اس جدوجہد میں جن حضرات نے حضرت شاہ صاحبؒ کے فکر کی ہر طرح تائید کی اور ان کے نظریئے پر مبنی انقلاب کی تیاری کے لیے کی جانے والی جدوجہد کے دائرے کو وسیع تر کیا ان میں مولانا محمد عاشق پھلتیؒ مولانا نور اللہ بڈھانویؒ، مولانا محمد امین کشمیریؒ، مولانا شاہ محمد ابوسعید رائے بریلویؒ مولانا مخدوم لکھنویؒ اور حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ تھے، (۲) جہاد کے ان مراکز کے ذریعے عوام الناس کے دلوں میں جہاد کی روح پھونکی گئی اور قربانی وجاں نثاری کا وہ جذبہ پیدا کیا گیا جو کسی مقصد کے حصول کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے افسوس حضرت شاہ صاحبؒ ۱۷۶۵ء میں وفات پا گئے اور ان کا خواب تشنۂ تعبیر رہ

(۱) حجۃ اللہ البالغہ باب الجہاد ص ۱۱۵۷۔ (۲) علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۲۸۔

گیا تاہم وہ اپنی کتابوں کے ذریعے اور اپنے فکر و عمل کے ذریعے ایک نصب العین متعین کر چکے تھے، انقلاب کا پورا لائحہ عمل تیار کر چکے تھے اور انقلاب کے بعد ممکنہ حکومت کے لیے مذہبی، اقتصادی، اور سیاسی اصولوں کی روشنی میں ایک مکمل نظام وضع کر چکے تھے، ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ لوگ میدانِ عمل میں آئیں، چناں چہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے حوصلہ دکھایا، حالاں کہ وہ اس وقت محض سترہ سال کے تھے مگر اپنے والد بزرگوار کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے عزم و استقلال سے کام لیا اور حضرت شاہ صاحبؒ کے نظریۂ انقلاب کو مخصوص لوگوں کے دلوں سے نکال کر عام انسانوں کے دلوں میں اس طرح پیوست کر دیا کہ ہر زبان پر جہاد اور انقلاب کے نعرے مچلنے لگے۔

انقلاب کی اس صدائے بازگشت کو دہلی سے باہر دور دور تک پہنچانے میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تینوں بھائیوں حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ کے علاوہ جن لوگوں نے پورے خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ اپنا بھرپور تعاون پیش کیا ان میں حضرت شاہ عبدالحیؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کے اسمائے گرامی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں، تربیت گاہ عزیزی سے نکل کر مسلح جد و جہد کو نصب العین بنانے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں اس انقلاب کی دستک نہ سنی گئی ہو اور جہاں اس آواز پر لبیک کہنے والے موجود نہ ہوں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اس تحریک کو دل و جان سے پروان چڑھایا مگر طرح طرح کی مشکلات اور مصائب بھی برداشت کیے، آپ کی جائداد بھی ضبط کی گئی، آپ کو شہر بدر بھی کیا گیا، آپ پر قاتلانہ حملے بھی کیے گئے، دو مرتبہ زہر دیا گیا، اور ایک مرتبہ ابٹن میں چھپکلی ملا کر پورے بدن پر مالش بھی کی گئی، جس سے بینائی بھی جاتی رہی اور بے شمار امراض بھی پیدا ہوئے، ان تمام مصائب کے باوجود ان کے پائے ثبات میں کبھی

لغزش محسوس نہیں کی گئی، ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے شاہ عالم بادشاہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور دہلی پر قابض ہو گیا، اس قبضے کے لیے جو سہ نکاتی فارمولہ اپنایا گیا وہ یہ تھا ''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' یہ فارمولہ اس لیے اختیار کیا گیا تاکہ بادشاہت کے خاتمے سے عوام میں بددلی اور مایوسی پیدا نہ ہو اور وہ بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں، اس لیے بادشاہ کے تخت و تاج کو تو باقی رکھا گیا مگر اس کے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے، قناعت پسند طبیعتوں کے لیے یہ فارمولہ بھی تسلی بخش تھا، مگر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان جیسا فکر رکھنے والے لوگ اس تعبیر میں مضمر فریب اور خطرے کو محسوس کر رہے تھے، یہ وہ مرحلہ تھا جب آپ نے انگریزی اقتدار کے خلاف نہایت جرأت مندانہ فتوی جاری کیا، جس کے فارسی متن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

''یہاں رؤساء نصاریٰ (عیسائی افسران) کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور اُن کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت خراج، باج، عشر و مال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوج داری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہیں، ہندوستانیوں کو اُن کے بارے میں کوئی دخل نہیں، بے شک نماز جمعہ، عیدین اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے، چناں چہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں، عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے، انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو اُن کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اُس کے اطراف و جوانب میں نہیں آسکتا، عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے، اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس

ملک میں داخل نہیں ہو سکتے، دہلی سے کلکتہ تک انہیں کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رام پور میں چوں کہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے، براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے"۔ (مگر اس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا)(۱)۔

یہ اولین فتویٰ ہے جو انگریزوں کے خلاف دیا گیا اور جس میں دارالحرب کا مخصوص اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا، جس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ ہر محب وطن مسلمان شہری پر فرض ہے کہ وہ ان اجنبی حکمرانوں کے خلاف اعلان جنگ کرے اور اس وقت تک سکون سے نہ بیٹھے جب تک قابضین کا ایک ایک فرد ملک کی سرحد سے باہر نہ ہو جائے۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے اس فتوے کا اثر یہ ہوا کہ خواص تو خواص عوام بھی انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (۲) یہ اسی فتوے کا اثر تھا کہ آپ کی تحریک حریت کے ایک جانباز سپاہی حضرت سید احمد شہیدؒ نے گوالیار کے مہاراجہ کو لکھا کہ یہ "بیگانگان، بعید الوطن و تاجران متاع فروش" آج بادشاہ بن بیٹھے ہیں، سمندر پار اجنبیوں اور سامان بیچنے والوں کا زمام اقتدار سنبھالنا واقعی عار کی بات تھی اور حضرت سید احمد شہیدؒ اس حوالے سے گوالیار کے مہاراجہ کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جنگ کرنا چاہتے تھے، ان خطوط کے علاوہ حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے پیر و مرشد رہنما و قائد حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے حکم پر امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھی تشریف لے گئے جو اس وقت جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ مل کر انگریزی فوجوں پر شب خوں مار رہا تھا، ۱۸۱۵ء تک یہ اشتراک کامیابی کے ساتھ جاری رہا، لیکن انگریزوں نے امیر علی خاں کو نواب کا خطاب اور محفوظ ریاست کا لالچ دے کر ہتھیار رکھنے پر مجبور کر دیا، اس صورت حال سے آزردہ خاطر ہو کر حضرت سید احمد شہیدؒ دہلی واپس ہو گئے، اس طرح ۱۸۱۸ء تک تمام چھوٹے بڑے

(۱) فتاویٰ عزیزی فارسی جلد اول ص ۱۷ مطبوعہ مطبع مجتبائی بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ ۲۴۸-۲۴۹۔
(۲) علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۱۰۲۔

علاقے اور ریاستیں انگریزوں کے زیر اقتدار آ گئیں۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اپنے ضعف، گوناگوں امراض اور پیرانہ سالی کے باوجود استخلاص وطن کے لیے اپنی جدوجہد کا سفر جاری رکھا، انگریزوں کو اقتدار سے دور رکھنے میں ناکامی کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے، اور نہ اپنے مقصد سے پیچھے ہٹے بلکہ انہوں نے بدلے ہوئے حالات میں ایک نیا لائحہ عمل مرتب کیا جس کے تحت دو کمیٹیاں بنائی گئیں، ایک کمیٹی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھی، اس میں شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلویؒ، مفتی رشید الدین دہلویؒ، مفتی صدر الدین آزردہؒ، مولانا حسن علی لکھنویؒ، مولانا حسین احمد ملیح آبادیؒ اور مولانا شاہ عبد الغنی دہلویؒ جیسے اولوالعزم حضرات شامل تھے، اس کمیٹی کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ جہاد کے اصل مرکز کو اس کے اصل کردار کے ساتھ باقی رکھے، تاکہ اس کے ذریعے ایک ایسی نسل کی آب یاری کا سلسلہ جاری رہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے طے کردہ خطوط کے مطابق منبر و محراب کی زینت بننے کی اہل بھی ہو اور محاذ جنگ پر دشمنوں سے طاقت آزمائی کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، دوسری کمیٹی کی قیادت حضرت سید احمد شہیدؒ کے سپرد کی گئی اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ کو اُن کا خصوصی مشیر متعین کیا گیا، اس کمیٹی کے ذمے یہ کام تھا کہ اس کے اراکین ملک بھر میں گھوم پھر کر عوام بالخصوص علماء کے دلوں میں انقلاب کا جذبہ پیدا کریں، رضا کار بھرتی کریں، اور انہیں محاذ جنگ پر لڑنے کی ٹریننگ دیں، مالیہ فراہم کریں، غیر ممالک کے ساتھ خاص طور پر مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کریں، اور جہاں بھی موقع ہو جنگ لڑیں، چناں چہ ۱۸۲۴ء میں حضرت شاہ احمد شہیدؒ نے پورے طور پر خود کو جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ (۱)

اس مقصد کے لیے حضرت سید احمد شہیدؒ نے سات ہزار میل کا ایک طویل انقلابی دورہ کیا جس کے دوران وہ ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی گئے، اس سفر کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عوام کو انگریزوں کے خلاف متحد کیا

(۱) تاریخ دیوبند ص ۱۹۱۔

جائے، ۲۱/ستمبر ۱۸۲۶ء کو حضرت سید احمد شہیدؒ نے فوجی کاروائی کا آغاز کیا اور کئی باضابطہ جنگیں لڑیں، ان جنگوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے خوب دادِ شجاعت دی، ۱۰/جنوری ۱۸۲۷ء کو عارضی حکومت بھی قائم ہوئی، لیکن ایک طرف مجاہدین کی بے سروسامانی دوسری طرف سکھوں اور انگریزوں کی جدید ترین اسلحہ سے لیس مشترک فوج، بے شمار چھوٹی بڑی جنگوں کے بعد ۱۸۳۱ء میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی، آپ نے اور آپ کے قریب ترین رفیق حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور دوسرے بے شمار ساتھیوں نے بالاکوٹ کے میدان میں جامِ شہادت نوش کیا۔(۱)

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اگرچہ استخلاصِ وطن کے لیے تھی، مگر اس پر مذہبی رنگ غالب تھا تاکہ عوام میں مذہبی جذبات بیدار ہوں، یہ محض تحریک آزادی ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے اعمال ومعتقدات کی اصلاح بھی مقصود تھی، اس تحریک سے وابستہ ہر شخص فوجی جرنیل بھی تھا، اور احیاء سنت کا علم بردار بھی اس تحریک کی بہ دولت ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم وجاں میں مذہب کی روح پوری طرح تحلیل ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی تحریک دوبارہ شروع ہوئی تو انگریزی فوج میں شامل مسلمانوں کو مذہب کے حوالے ہی سے بغاوت پر اُکسایا گیا، انہیں بتلایا گیا کہ جس کارتوس کو استعمال کے وقت منہ سے کھینچنا پڑتا ہے اس میں سُور کی چربی ملی ہوئی ہے، یہ سن کر مسلمان فوجی بھڑک گئے اور اس طرح میرٹھ سے تحریک آزادی کے دوسرے دور کا آغاز ہوا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم نہیں ہوئی، بلکہ وہ جذبہ جو اس تحریک کے ذریعے عوام وخواص کے دلوں میں پروان چڑھا تھا اسی طرح تروتازہ رہا، ابتدا میں یہ ایک چنگاری تھی جو آہستہ آہستہ ایک شعلہ بن گئی، انگریز اس تحریک کو جسے انہوں نے وہابی تحریک کا نام دیا تھا کچلنے کے لیے پوری طرح سرگرمِ عمل رہے۔ ۱۸۴۸ء میں انگریزوں کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ افراد نے پنجاب

(۱) تاریخ ہند: ۳۹۸، سیرت سید احمد شہیدؒ ج۲ ص ۳۱۴۔

کے متعدد شہروں میں بے شمار جنگیں لڑیں، بہت سے لوگوں نے جامِ شہادت نوش کیا، بے شمار مجاہدین گرفتار کیے گئے ان پر مقدمات چلے اور انہیں بغاوت کے الزام میں سرِ دار چڑھایا گیا۔

بعد میں جتنے بھی معرکے ہوئے، ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک، ۱۸۵۷ء کا جہادِ شاملی، ۱۹۱۴ء کی تحریک ریشمی رومال، ۱۹۱۹ء کا جلیان والا باغ قتلِ عام، ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون، ۱۹۲۲ء کی موپلا بغاوت، ۱۹۲۲ء میں چوراچوری فائرنگ، ۱۹۳۰ء میں تحریک سول نافرمانی ونمک ستیہ گرہ، ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک، ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کی قربانیاں، ۱۹۴۶ء میں ممبئی کے فوجی بحری بیڑے کے جوانوں کی بغاوت اور اس کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں پر پولیس کی وحشیانہ فائرنگ کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں کی شہادت، یہ تمام واقعات دراصل حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک جہاد کے تسلسل کا عنوان ہیں، اور ان میں سے ہر عنوان میں علمائے کرام کے قربانیوں کی ایک طویل داستان پوشیدہ ہے اور ہر داستان کا ایک ایک لفظ لاکھوں مسلمانوں کے لہو سے رنگین اور روشن ہے۔

تحریک آزادی میں دارالعلوم دیوبند کا حصہ

دارالعلوم دیوبند کا مقصد تاسیس:

دارالعلوم دیوبند کا قیام مسلمانوں میں دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے عمل میں آیا، لیکن اس کی پوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ دارالعلوم صرف ایک مدرسہ ہی نہیں تھا بلکہ دین اسلام کی حفاظت کا ایک مضبوط قلعہ بھی تھا، دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے اصل مقصد پر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے اس ارشاد سے بہ خوبی روشنی پڑتی ہے، جسے ان کے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ”دیوبند کا مدرسہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا گیا تھا، تعلیم و تعلم درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن خود اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا، فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک گزار دوں گا“[1]۔

اس سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کا مقصد ایسے رجال کار تیار کرنا تھا جو ایک طرف علوم دینیہ میں پختہ کار ہوں اور دوسری طرف اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں جو اکابرین دیوبند نے ۱۸۵۷ء میں تشنۂ تکمیل چھوڑ دیا تھا، وہ کام کیا تھا، ناکامی کے لفظ سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے، وہ کام تھا غیر ملکی استعماریت پسندوں یعنی انگریزوں کو

(۱) احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن ص: ۱۷۱۔

ارض وطن سے باہر نکال کر ملک کو آزاد کرانا، اس وقت یہ تحریک ناکام ہو گئی تھی، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب ہمیشہ کے لیے یہ باب بند کر دیا جائے، بلکہ اہل دانش ناکامی سے تحریک پاکر اور شکست کے ملبے میں دبے ہوئے تجربات سے فائدہ اٹھا کر کامیابی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، یہی تھا حضرت شیخ الہندؒ کا نصب العین اور اسی نصب العین کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی زندگی گزاری۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی:

اکابرین دیوبند نے دارالعلوم کے قیام سے دس سال پہلے انگریزوں کے ساتھ جو جنگ لڑی اسے انگریز غدر اور بغاوت کہتے ہیں، مگر حقیقت میں انگریزوں کے خلاف یہ ایک مسلح جنگ تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے لڑی گئی، یہ جنگ تھانہ بھون اور شاملی میں لڑی گئی، یہ دونوں دیوبند کے قریب دو قصبے ہیں، اس وقت تھانہ بھون ایک بڑا قصبہ تھا جس کی آبادی پینتیس ہزار افراد پر مشتمل تھی، تھانہ بھون نہایت خوش حال قصبہ تھا، قصبے کے چاروں طرف ایک مضبوط دیوار تھی جس میں آمد و رفت کے لیے چار دروازے رکھے گئے تھے، اسی قصبے کی ایک تاریخی مسجد میں جماعت دیوبند کے بزرگ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خانقاہ بھی تھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت تھے، ان دنوں انگریزوں کے خلاف ملک کے گوشے گوشے میں نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے، بہت سے لوگ ٹولیاں بنا بنا کر دہلی پہنچ رہے تھے تاکہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ساتھ مل کر دہلی کو جو مغلیہ سلطنت کا پایۂ تخت تھا انگریزوں سے خالی کرایا جا سکے، ضرورت تھی کہ دہلی کے اطراف میں بھی جہاں جہاں انگریزوں کی چھاؤنیاں ہیں، یا ان کے کیمپ قائم ہیں ان کو نشانہ بنایا جائے اور جتنا علاقہ ہو سکے ان سے خالی کرا لیا جائے، اس مقصد سے یہ اکابرین جن کی عمریں اس وقت بالترتیب بیالیس پچیس اور انتیس سال تھی تھانہ بھون میں جمع ہوئے، یہ ایک بڑا مشاورتی

اجتماع تھا جس میں اطراف تھانہ بھون کے بہت سے قصبوں اور شہروں سے علماء شریک ہوئے، تمام حضرات نے جہاد کی ضرورت پر اتفاق کیا، اور اسی وقت حضرت حاجی صاحبؒ کو امیر منتخب کر کے بیعت کی گئی، اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ تھانہ بھون اب انگریزوں کی عمل داری سے آزاد ہے، یہاں اسلامی حکومت قائم ہوچکی ہے، انگریزوں کے جو افسران قصبہ کے اندر موجود تھے ان کو باہر نکال دیا گیا۔

انگریزی توپ خانے پر حملہ:

خبر ملی کہ سہارن پور سے انگریزی فوج کے کچھ جوان توپ خانہ لے کر شاملی جارہے ہیں، یہ لوگ تھانہ بھون سے گزریں گے، طے پایا کہ اس فوجی قافلے پر حملہ کیا جائے اور ان سے توپ خانہ چھین لیا جائے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے خود بڑھ کر اس حملہ کی ذمہ داری لی، قصبے کے باہر سڑک کے کنارے ایک باغ تھا، طے پایا کہ کچھ مجاہدین حضرت گنگوہیؒ کی قیادت میں باغ کے اندر چھپ جائیں، اور جس وقت رات کو فوج کا قافلہ باغ کے سامنے سے گزرے بندوقوں کے فائر کھول دیے جائیں، چناں چہ ایسا ہی ہوا، جس وقت توپ خانہ لے کر انگریزی فوج کا ایک دستہ باغ کے سامنے پہنچا حضرت گنگوہیؒ نے اشارہ کیا، اسی وقت سب لوگوں نے اپنی اپنی بندوقوں سے گولی چلادی، بہ یک وقت اتنی گولیاں چلنے سے قافلے میں بھگدڑ مچ گئی، کچھ فوجی مارے گئے کچھ جوان سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے، جس کو جدھر موقع ملا وہ ادھر سے فرار ہوگیا، توپ خانہ وہیں رہ گیا، بعد میں مجاہدین اسے گھسیٹتے ہوئے لائے اور خانقاہ کے سامنے ڈال دیا۔

شاملی میں فوجی کیمپ پر حملہ:

اس زمانے میں انگریزوں نے شاملی میں ایک فوجی کیمپ قائم کر رکھا تھا، یہ کیمپ تحصیل کی مضبوط و مستحکم عمارت کے اندر تھا، طے ہوا کہ اس کیمپ پر حملہ کیا جائے اور تحصیل کی عمارت کو انگریزوں سے خالی کرالیا جائے، اور اسلامی مملکت کا دائرہ شاملی اور کیرانہ تک وسیع کیا جائے، مجاہدین کی یہ جماعت جس کی قیادت خود امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ فرمارہے تھے شاملی کے لیے روانہ ہوئی، انگریزی فوج کو خبر ملی تو وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی، مجاہدین نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، انگریزوں نے دیواروں میں سوراخ کر کے مجاہدین پر گولیاں چلائیں جس سے مجاہدین کو کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا، حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے اور ایک روایت کے مطابق (سوانح قاسمی: ۲/۱۳۴) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بڑی بہادری دکھلائی، اور تحصیل کے پھاٹک کو آگ لگادی، مجاہدین آگ کے شعلوں کو پھلانگتے ہوئے تحصیل کے اندر گھس گئے، بڑا سخت معرکہ ہوا، بہت سے فوجی مارے گئے، دست بہ دست جنگ کے بعد محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے، عین اسی وقت جب انگریزی فوج کے جوان ہتھیار ڈال رہے تھے، حضرت حافظ محمد ضامنؒ نے انگریزی فوج کی گولی سے جام شہادت نوش کیا، یہ واقعہ ۲۴/محرم الحرام ۱۲۷۴ھ دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت پیش آیا(۱)۔

معرکۂ شاملی کا انجام:

ٹھیک اسی دن جس دن حضرت حافظ محمد ضامنؒ نے شاملی کے میدان میں جام شہادت نوش کیا انگریزی فوجیں لال قلعہ میں داخل ہوگئیں، جو علامتی شہنشاہیت بہادر شاہ ظفر کی شکل میں باقی تھی وہ بھی دم توڑ گئی، شاملی کا معرکہ تین دن تک جاری رہا، مجاہدین کو کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا، ایک سو تیرہ محصورین بھی مارے گئے، انگریز وقائع نگار ہنری جان کین کا بیان ہے: ''کہ لڑائی تمام دن جاری رہی، لیکن چوں کہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ان کا پلڑا بھاری رہا'' انھوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطے کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگادی، محصورین میں ۱۱۳ آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خاں سب کلکٹر بھی تھا(۲)۔

انگریزوں نے شاملی میں حملے کا سخت انتقام لیا، تھانہ بھون کو جو نو مولود اسلامی مملکت

(۱) تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۵۰۶، ۵۰۷۔ (۲) تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۵۰۹۔

کا دار الخلافہ تھا پوری طرح تباہ و برباد کر دیا، شہر پناہ توڑ دی، دروازے جلا دیے، مکانات تباہ کر دیے، دکانیں لوٹ لیں، جو لوگ تھانہ بھون سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے وہ نکل گئے جو لوگ باقی رہ گئے ان کو قتل کر دیا گیا یا پھانسی پر لٹکا دیا گیا، ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے بعد جب یہ قصبہ دوبارہ آباد ہوا تو اس وقت بھی ۱۳۲ نعشیں درخت پر لٹکی ہوئی تھیں (۱)۔

آزادی کی جدوجہد سے حقیقی دلچسپی:

تاریخ دار العلوم دیوبند کے مصنف جناب سید محبوب رضویؒ لکھتے ہیں ''ان حضرات کے دلوں میں چوں کہ برطانوی سامراج کی طرف سے ایک تلخ جذبہ ہمیشہ موجود رہا، اس لیے اس جذبے کے تحت قیام دار العلوم ۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دار العلوم کے بزرگ ملکی تعمیر اور جنگ آزادی کی جدوجہد سے حقیقی دلچسپی اور ہمدردی اپنے سینوں میں رکھتے آئے ہیں، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ ''۱۸۵۷ء کے بعد صرف یہی جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو ہندوستان میں زندہ رکھا'' اور بالآخر اس تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا، علماء دیوبند ہمیشہ اولوالعزمی اور توکل علی اللہ کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صف اول میں رہے ہیں بلکہ اکثر اوقات انھوں نے تحریک آزادی کی قیادت کی ہے، اور زیادہ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو اول اول یہ خیال انھوں ہی نے دیا، آزادی کے جذبے میں جو حرارت، طاقت اور عمومیت پیدا ہوئی وہ انھی کی رہین منت تھی، ان میں سے متعدد حضرات نے انگریزی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، انگریزی فوجوں سے دوبارہ جنگ کی، متعدد حضرات ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا خاصہ حصہ جیلوں میں گزارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے''(۲)۔

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی: ۴/ ۸۵۶۔ (۲) تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/ ۵۰۹، ۵۱۰۔

تحریک شیخ الہندؒ:

اب آیئے اس عظیم الشان تحریک کی طرف جس کو لوگ ریشمی رومال کی تحریک بھی کہتے ہیں، حالاں کہ درحقیقت وہ ریشمی رومال کی تحریک نہیں تھی بلکہ استخلاص وطن کی ایک منظم مستحکم اور مربوط تحریک تھی، جس کا آغاز فی الحقیقت دار العلوم دیوبند کے قیام کے دس سال بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات مبارکہ ہی میں ہو گیا تھا، یہ تحریک کئی مرحلوں پر مشتمل ہے، ہم ہر مرحلے پر الگ الگ مختصر الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

ثمرۃ التربیۃ کا قیام:

۱۸۷۸ء میں فضلائے دار العلوم نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی اجازت اور ایماء سے ''انجمن ثمرۃ التربیۃ'' قائم کی، یہ نام بھی حضرت نانوتویؒ ہی کا تجویز کردہ ہے، بہ ظاہر اس کا مقصد جیسا کہ تاریخ دار العلوم کے مؤلف نے لکھا ہے یہ تھا کہ جو حضرات دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں، وہ اپنی مادر علمی کے ساتھ مربوط ہوں، اور اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اس ادارے کے لیے وقف کریں، یہ جماعت ابتداءً ۱۹/ افراد پر مشتمل تھی، اس کی سالانہ پیش کش کی مقدار ۹۶ روپے آٹھ آنہ تھی (۱) لیکن مشہور مؤرخ حضرت مولانا محمد میاںؒ تحریر فرماتے ہیں ''ثمرۃ التربیۃ'' سے صرف فضلاء منتسبین کی تنظیم مقصود نہیں تھی بلکہ دراصل اس کا مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا جو قیام دار العلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلے میں کام کر سکیں (۲)۔

انجمن کے سرپرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے اور روح رواں حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے، افسوس یہ انجمن زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی، دو سال کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحلت فرما گئے، اس حادثے کی وجہ سے انجمن کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں، البتہ

(۱) تاریخ دار العلوم: ۱/ ۱۸۷۔ (۲) اسیران مالٹا، ص: ۱۲۔

حضرت شیخ الہندؒ اپنے کام میں لگے رہے، اور اپنے شاگردوں کی ذہن سازی کرکے انجمن کے مقاصد کی تکمیل کرتے رہے۔ [1] اس کا اثر یہ ہوا کہ جو طلبہ دار العلوم دیوبند میں پڑھنے آتے تھے وہ حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی افکار وخیالات سے متاثر ہوکر اپنے اپنے علاقوں میں واپس جاتے ان کی تبلیغ کرتے، اور اس مقصد کی اشاعت کے لیے ادارے اور مدرسے قائم کرتے، ایسے ہی ایک شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا، دار العلوم سے واپسی کے بعد اپنے وطن حیدرآباد سندھ کے ایک گاؤں گوٹھ پیر میں دار الرشاد کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، دوسرے شاگردوں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں دینی خدمات کے عنوان سے مراکز قائم کیے۔

جمعیۃ الانصار کی تأسیس:

جمعیۃ الانصار کا قیام بھی حضرت شیخ الہندؒ کا زبردست کارنامہ ہے، اسے اگر تحریک شیخ الہندؒ کا ایک اہم سنگ میل قرار دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، انجمن ثمرۃ التربیت کے تقریبا تیس سال بعد ۱۳۲۷ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، حضرت شیخ الہندؒ اس کے بانی اور روح رواں تھے، اور ناظم حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، جنہیں حضرت شیخ الہندؒ نے سندھ سے خاص اسی مقصد کے لیے دیوبند طلب کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اس جمعیۃ کو بہت کم مدت میں ملک گیر جماعت کی شکل دیدی، اس جمعیۃ کا ظاہری مقصد جیسا کہ اس کی رودادوں میں لکھا ہے دار العلوم دیوبند کے اثرات کو ہمہ گیر بنانا تھا، اور اس کے مقاصد کی ترویج کرنا تھا، لیکن در پردہ یہ ایک انقلابی تحریک تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ الانصار کی کوششوں سے منعقد ہونے والے دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان جلسۂ دستار بندی (منعقدہ ۱۹۱۰ء) میں سندھ میں چلنے والی تحریک آزادی کے قائدین خواجہ غلام محمد دین پوریؒ اور مولانا تاج محمد امروٹیؒ بھی تشریف لائے، یہ جلسہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، تیس ہزار افراد نے شرکت کی، یہ پہلا موقع تھا جس میں

(۱) اسیران مالٹا ص: ۲۳۔

مسلمانوں کے کسی اجتماع میں اتنی بڑی تعداد شریک ہوئی، اس اجتماع سے جمعیۃ الانصار کا تعارف بھی ہوا اور اس کو اپنا دائرۂ عمل بڑھانے کا موقع بھی ملا۔

جمعیۃ الانصار کا پہلا باقاعدہ اجلاس عام اپریل ۱۹۱۱ء مرادآباد میں ہوا جو نہایت کامیاب رہا، جلسے میں عوام کی بھیڑ ٹوٹ پڑی، اکابر علماء کی بڑی تعداد شریک جلسہ ہوئی، جلسہ انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا مگر اس نے انگریزی حکومت کے کان کھڑے کردئے، کیوں کہ ۱۸۵۷ء سے اب تک مسلمانوں کی کسی تنظیم کا اتنا بڑا جلسہ کہیں منعقد نہیں ہوا تھا، مسلمانوں کا یہ جوش وخروش کسی انقلاب کا پیش خیمہ بھی بن سکتا تھا اس لیے انگریزی حکومت کا چونک اٹھنا اور شک وشبہ میں مبتلا ہونا فطری تھا۔

جمعیۃ الانصار کا دوسرا اجلاس ۱۹۱۳ء میں میرٹھ میں ہوا اس میں بھی اکابر علماء وذمہ داران دار العلوم دیوبند نے شرکت کی، جلسہ کی صدارت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمائی، تیسرا اجلاس ۱۹۱۴ء میں شملہ میں ہوا، شملہ انگریزوں کا راحت کدہ تھا، وہاں مسلمان بہت کم تعداد میں رہتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے علماء واکابر کا شاہانہ انداز میں استقبال کیا، جلسے میں شرکاء کی حاضری بھی توقع سے زیادہ رہی، جمعیۃ الانصار کے جلسوں نے مسلمانان ہند کے تن مردہ میں ایک نئی جان ڈال دی تھی، ان کی توانائیاں واپس آرہی تھی، مایوسی کی دبیز تہیں جو ان کے دلوں پر چھائی ہوئی تھیں علماء کے پرجوش بیانات سے وہ تہیں کھل رہی تھیں، امیدوں کے افق پر سورج اپنی تابانیاں بکھیر رہا تھا۔

مگر اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت چوکنی ہوگئی، حالاں کہ ان جلسوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نہ کچھ کہا گیا، نہ کوئی قابل اعتراض بات ہوئی، صرف دین کی باتیں ہوئیں، لیکن علماء کی شرکت اور ان کے حالات کے مطابق کی جانے والی تقریروں نے مایوس مسلمانوں کے دلوں میں امید کی ایک جوت جگادی، بھلا انگریز اسے کیسے گوارا کرتے، دار وگیر شروع ہوگئی، دار العلوم دیوبند کا نام بھی سامنے آیا کہ یہ سب کچھ اسی کے

جنگ میں بھر پور حصہ لیا ہے یہاں تک کہ اس کے بزرگوں نے قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں، آنے والے صفحات میں ہم جدوجہد آزادی کے لیے جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا ذکر کریں گے جمعیۃ کی خدمات بھی دارالعلوم دیوبند ہی کی خدمات ہیں، کیوں کہ یہ جماعت دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں نے سیاسی مقاصد کے لیے تشکیل دی تھی، یہ جماعت ۱۹۴۷ء تک آزادئ ہند کے لیے سرگرم عمل رہی، اور تقسیم ہند کے بعد وہ یہ جدوجہد کرتی رہی کہ جو لوگ اپنی مرضی سے یہاں رہ گئے ہیں وہ ثابت قدمی کے ساتھ یہاں رہیں، یہ ملک ان کا ہے انہیں یہاں سے کوئی نکالنے والا نہیں ہے، الحمد للہ یہ جماعت آج بھی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مسائل کے حل کے لیے حکومتوں سے لڑ رہی ہے، اس جماعت کا پورے ملک میں بڑا نیٹ ورک ہے اور اس میں اکثریت دارالعلوم دیوبند کے فضلاء وعلماء کی ہے۔

ریشمی رومال کی تحریک

تاریخ حریت کا ایک گم شدہ باب

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اقتدار آچکا تھا جس کے بعد لال قلعہ کا علامتی تاج وتخت چھین لیا گیا اور مغلیہ حکومت کے آخری چشم وچراغ بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر کے رنگون میں قید کر دیا گیا، اس طرح انگریزوں کے خلاف تحریک حریت کی سوسالہ جدوجہد نے دم توڑ دیا، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں اکابرین دیوبند نے شاملی کے میدان میں سقوط دہلی کے آخر تک اپنی شجاعت کے جوہر ضرور دکھلائے، لیکن مادّی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ معرکۂ حق وباطل زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا، حضرت سید ضامن شہیدؒ اور دوسرے بے شمار علماء اور عوام نے جام شہادت نوش کیا، تھانہ بھون پر انگریزوں کے مکمل قبضے کے بعد جسے علماء دیوبند نے اسلامی حکومت کا دارالخلافہ بنا دیا تھا آس پاس کے علاقوں سے ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا جن میں علماء اور حفاظ کی کثرت تھی، ان میں سے بیشتر کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، تھانہ بھون جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی کھنڈر میں تبدیل ہو گیا، تمام باشندے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کر گئے، دو سال بعد ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کے بعد لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو انہوں نے یہ ہولناک منظر دیکھا کہ ایک سو بتیس شہیدوں کی لاشیں درختوں پر لٹکی ہوئی ہیں۔(۱)

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی، ج ۴ ص ۲۸۱۔

۱۸۵۷ء کی تحریک میں مسلمان اپنے علماء کی قیادت میں پیش پیش تھے اس لیے اس انقلاب میں ناکامی کا خمیازہ بھی مسلمانوں ہی کو بھگتنا پڑا، یہ ہی گرفتار کیے گئے، ان ہی کو قتل کیا گیا، ان ہی کی جائدادیں ضبط کی گئیں، ہندوستان کے طول وعرض میں عیسائی پادری کیڑوں مکوڑوں کی طرح پھیل گئے اور انہوں نے لالچ اور زور زبردستی سے ملک کے سادہ لوح عوام بالخصوص مسلمانوں کو عیسائی بنانا شروع کردیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ختم کردیے گئے، ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی شہر اسلامی علوم وفنون کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، یہ اجڑا تو اس کی علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی، ان حالات میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے اپنی خداداد بصیرت کے ذریعے یہ محسوس کیا کہ اگر اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا عزیز ہے تو اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کے لیے مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کرنا ضروری ہے، چناں چہ ۱۵/ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/ مئی ۱۸۶۶ء کو سرزمین دیوبند کی تاریخی مسجد چھتہ میں ایک مدرسہ عربیہ قائم کیا گیا جس کے پہلے استاذ مُلّا محمود دیوبندیؒ اور پہلے شاگرد محمود حسن دیوبندیؒ تھے، یہ وہی محمود حسنؒ ہیں جو بعد میں شیخ الہندؒ کہلائے، اور جنہوں نے اپنے جذبۂ حب الوطنی سے ہندوستان کی جہاد حریت کا ایک ناقابل فراموش باب رقم کیا، افسوس ملک کے فرقہ وارارنہ حالات نے ہندوستان کی آزادی کے لیے دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں کی قربانیوں کو طاق نسیان پر رکھ دیا ہے اور آج مدارس عربیہ کے متعلقین کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ آزادی جو ہمیں ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو حاصل ہوئی تھی اس میں علماء دیوبند کی بے مثال قربانیاں بھی شامل ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند جو بعد میں دارالعلوم کہلایا صرف ایک مدرسہ ہی نہیں تھا جہاں قوم کے بچے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے ہوں بلکہ یہ ایک تربیت گاہ بھی تھی جس میں تحریک آزادی کے لیے ذہن سازی بھی کی جاتی تھی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسی ادارے کے تربیت یافتہ تھے، شمع آزادی پر جاں نثار ہونے کا جذبہ انہیں اپنے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے وراثت میں ملا تھا،

وقت کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ ان کے دل میں پروان چڑھتا رہا یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں ایک ایسی تحریک نے جنم لیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی آزادی کے لیے تیسری سب سے بڑی اور منظم تحریک کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے، ہندوستان کی تاریخ حریت میں یہ تحریک ریشمی رومال یا تحریک شیخ الہند کے نام سے معروف ومشہور ہے، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہوجاتی تو آج ہندوستان کا سیاسی اور جغرافیائی نقشہ دوسرا ہوتا، اس تحریک کے روح رواں اور قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے اور اس کا مرکز دیوبند کے محلّہ ابوالمعالی میں واقع حضرت کا دیوان خانہ تھا۔(۱)

۱۸۵۷ء کی شکست وریخت کے بعد اکابرین دیوبند نے قیام مدارس کا جو فیصلہ کیا اس کے امید افزاء نتائج سامنے آرہے تھے، چاروں طرف دارالعلوم دیوبند کی علمی ترقیات کا شور تھا، مگر سیاست کے سمندر کی سطح پر ہیبت ناک خاموشی طاری تھی جو کسی زبردست طوفان کا پیش خیمہ تھی، پرسکون سمندر کی گہرائیوں میں تلاطم برپا تھا، یہ تلاطم کب طوفان بن کر انگریزی سامراج کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائے اس کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار تھا، منصوبے بن رہے تھے، مشورے ہورہے تھے کہ ۱۴/ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا یہ وہ موقع تھا کہ کسی بیرونی طاقت کی مدد سے ملک کے اندر انگریزوں کے خلاف بغاوت کرکے کامیابی حاصل کی جاسکتی تھی، ۱۹۱۵ء میں جب یہ جنگِ عظیم اپنے پورے شباب پر تھی اور انگریزی حکومت انتہائی خطرناک حالات سے دوچار تھی، پوری دنیا میں اس کی فوجیں اپنے مخالفین سے نبرد آزما تھیں، حکمرانوں کی تمام توجہ اس نقطے پر مرکوز تھی کہ کس طرح اپنے اقتدار کو محفوظ رکھا جائے اور کس طرح دشمنوں کو شکست دی جائے، برطانیہ نے اپنی پوری قوت ترکی اور جرمنی میں جھونک رکھی تھی، ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں پر آزاد قبائل کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اس مقصد کے لیے انہوں اپنے خاص شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل روانہ کیا

(۱) تاریخ دیوبند: ۲۲۴۔

تا کہ وہ قبائلی سرداروں سے مل کر ممکنہ بغاوت کے امکانات کا جائزہ لیں، کابل میں جرمن کا ایک خفیہ فوجی مشن پہلے سے موجود تھا جس کے متعلق یہ امید تھی کہ اس کے اراکین اس تحریک کے ساتھ تعاون کریں گے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے افغانستان میں اپنے قیام کے دوران کانگریس کمیٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی جس کا انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ الحاق کیا، حزب اللہ کے نام سے ایک فوجی یونٹ بھی قائم کیا۔ (۱)

اس واقعے سے بہت پہلے حضرت شیخ الہندؒ مختلف مقامات پر اپنے مراکز قائم کر چکے تھے، دیوبند، دہلی، کراچی، دین پور شریف، چکوال وغیرہ شہروں میں یہ مرکز باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہے تھے اور خاموشی کے ساتھ لوگوں سے جہاد پر بیعت لی جارہی تھی، رازداری کا حال یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد خاص حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تک اس سے بے خبر تھے، حضرت مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح ''نقش حیات'' میں لکھا ہے کہ ''مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ لوگوں سے جہاد کی بیعت لے رہے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے انگریزوں کو خبر ہو گئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمانوں کا یہ دینی مرکز اجاڑ دیا جائے گا چوں کہ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی اس لیے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہندؒ سے پوچھوں گا، واقعہ یہ ہی تھا باوجود یکہ مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے مگر اس وقت کسی کاروائی کی خبر نہیں کی گئی''۔ (۲)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور ان کے بعض رفقاء بھیس بدل کر افغانستان پہنچ چکے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے منصوبے کے مطابق یہ حضرات چاہتے تھے کہ افغانستان کی فوج ہندوستان پر حملہ کر دے اور اندر سے مجاہدین اٹھ کھڑے ہوں، انگریز کی جو فوج محاذ جنگ پر یا اندرون ملک موجود ہے اسے ان حالات میں لامحالہ ہزیمت اٹھانی پڑے گی، اس منصوبے پر امیر حبیب اللہ خاں فرماں روائے افغانستان سے گفتگو ہوئی اس نے منصوبے سے اتفاق کیا لیکن یہ شرط رکھی کہ پہلے ''انڈین نیشنل کانگریس'' کے بڑے لیڈروں میں

(۳) تاریخ دیوبند ۲۲۷، نقش حیات ج ۲ ص ۱۳۷، سرگزشت مجاہدین ص ۵۱۳۔ (۴) نقش حیات: ج ۲ ص ۲۵۵۔

سے کوئی آکر تفصیلی بات چیت کرے اور ہم دونوں کے درمیان کوئی باضابطہ معاہدہ طے پائے، افسوس ایسا نہ ہو سکا، اگر یہ حملہ ہو جاتا تو ہندوستان میں موجود انگریزوں کی ۱۵/ ہزار فوج کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ (۱)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے افغانستان، یاغستان اور دوسرے سرحدی علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد دو کام کیے ایک تو الجنود الربانیہ (خدائی فوج) تشکیل دی، اس کا کمانڈر ان چیف حضرت شیخ الہندؒ کو مقرر کیا گیا اور اس کا مرکز مدینہ منورہ کو بنانا طے کیا گیا، مولانا عبیداللہ سندھیؒ قائم مقام کمانڈر مقرر ہوئے، اسی کے ساتھ ایک عارضی ہندوستانی حکومت کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کے پہلے صدر راجہ مہندر پرتاپ سنگھ، وزیر اعظم مولوی برکت اللہ اور وزیر امور ہند مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے، ان تمام واقعات کی تفصیلات ''تحریک شیخ الہند'' نامی کتاب میں موجود ہیں۔

ادھر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی یہ سرگرمیاں جاری تھیں، دوسری طرف حضرت شیخ الہندؒ خود افغانستان، یاغستان اور ترکی کے سفر کا ارادہ کیے بیٹھے تھے اور اس سلسلے میں مشورے ہو رہے تھے کہ اچانک ڈاکٹر مختار انصاری اور دوسرے باخبر حضرات کے ذریعے سے یہ اطلاع ملی کہ حضرت شیخ الہندؒ کا تمام منصوبہ حکومت برطانیہ کے علم میں آچکا ہے، اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اب بہ راہ راست ان ملکوں کا سفر نہ کیا جائے بلکہ حج کے ارادے سے حجاز مقدس کے لیے رخت سفر باندھا جائے اور وہاں جا کر مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا جائے، چناں چہ آپ ۱۶/ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اپنے چند رفقاء کے ساتھ بمبئی ہوتے ہوئے حجاز پہنچ گئے، راستے میں ہر جگہ ہزاروں لوگ رخصت اور ملاقات کے لیے موجود تھے، حکومت گرفتاری چاہتی تھی مگر یہ بھی چاہتی تھی کہ یہ کام خاموشی سے ہو تا کہ مسلمان مشتعل نہ ہوں، اس لیے حکومت نے یہ طے کیا کہ بمبئی میں گرفتاری عمل میں لائی جائے، لیکن گرفتاری کے احکامات تاخیر سے بمبئی پہنچے اس لیے وہاں بھی گرفتاری ممکن نہ ہو سکی، عدن اور جدہ کے گورنروں کو بھی گرفتاری کے احکامات روانہ کیے گئے لیکن من جانب اللہ ایسا ہوا کہ آپ بہ حفاظت مکہ مکرمہ

(۱) مشاہدات کابل و افغانستان ص ۳۲۔

پہنچ گئے۔(۱)

حجاز مقدس پہنچ کر آپ نے گورنر غالب پاشا اور ترکی کے وزیر جنگ سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ہندوستان کو آزاد کرانے کا منصوبہ رکھا، ان لوگوں نے پورے تعاون کا وعدہ کیا اور اس سلسلے میں ہندوستان کے قبائلی علاقوں کے سرداروں کو متعدد خطوط بھی تحریر کئے، یہ خطوط حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ایک مخلص دوست مولانا ہادی حسنؒ کے سپرد کئے تاکہ ان کو قبائلی سرداروں تک پہنچایا جاسکے، حکومت برطانیہ کو ان خطوط کا علم تو ہوگیا لیکن وہ یہ نہ جان سکی کہ خطوط کس کے پاس ہیں، مولانا ہادی حسن بہ حفاظت اپنے مستقر تک پہنچ گئے اور خطوط بھی پوری رازداری کے ساتھ کابل پہنچادیئے گئے (۲)۔

غالب پاشا کے جو خطوط حضرت شیخ الہندؒ نے روانہ کئے تھے ان کی نقلیں قبائلی علاقوں میں مولانا محمد میاں انصاری نے پہنچائیں، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے رفقاء نے افغانستان میں قیام کے دوران جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے جیسے خطوط کی ترسیل، عارضی حکومت کی تشکیل، جنود ربانیہ کا قیام اور ان کے ذمہ داروں کی تقرری ان تمام امور کی تفصیلات سے حضرت شیخ الہندؒ کو مطلع کرنا ضروری تھا اس غرض سے چند خطوط لکھے گئے، تاریخ حریت میں یہ خطوط ریشمی خطوط کے نام سے مشہور ہیں، یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر مشتمل تھے، ان میں سے پہلا خط جو چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا، شیخ عبدالرحیم کے نام تھا، جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ حجاز جاکر خطوط پہنچائیں، دوسرا خط جو دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا تھا حضرت شیخ الہندؒ کے نام تھا تیسرا خط پہلے خط کا تتمہ تھا، اور یہ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے نام تھا، یہ پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا تھا ان پر عبید اللہ کے دستخط ہیں اور ۹/۱۰/ جولائی ۱۹۱۶ کی تاریخ درج ہے، یہ تینوں خطوط مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنے ایک معتمد خاص عبدالحق کو دے کر سندھ روانہ کیا کہ وہ شیخ عبدالرحیم کو جو تحریک شیخ الہند کے رکن بھی تھے پہنچادیں اور وہ انہیں لے کر حجاز چلے جائیں، افسوس یہ خطوط عبدالحق کی کوتاہی کی بنا پر برطانوی حکومت کے وفادار حق نواز خاں کے ہاتھ لگ گئے اور اس نے پنجاب کے

(۱) نقش حیات ج ۲ ص ۱۵۹۔ (۲) تاریخ دیوبند ص ۲۳۰-۲۳۱۔

گورنر مائکل اڈوائر کے حوالے کر دیئے۔

اس درمیان حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس سے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد تک پہنچنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ والئ مکہ شریف حسین نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا، غالب پاشا جو آپ کا قدر دان اور مخلص تھا برطرف کردیا گیا، شریف حسین برطانیہ کا وفادار تھا، اس نے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جدہ اور جدہ سے مصر اور مصر سے مالٹا روانہ کردیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جو آپ کے ساتھ گرفتار ہوئے اور آپ ہی کے ساتھ مالٹا کی اسارت میں رہے لکھتے ہیں ''پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری شریف ہی کی طرف سے عمل میں آئی ہے مگر انگریز افسر کے بیان لینے اور سوالات کرنے پر ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان کاروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو صوبہ سرحد، کابل اور دیوبند میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں (۱)۔

مشہور زمانہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانوی حکومت پر قبل از وقت اس منصوبے کے انکشاف کی وجہ سے یہ گرفتاری عمل میں آئی، حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جنگ عظیم کے اختتام تک مالٹا میں قید رکھا گیا اور تین سال دو ماہ کے بعد ۱۳/ جنوری ۱۹۱۷ء کو ہندوستان روانہ کیا گیا۔(۲)

خطوط کی ضبطی کے ذریعے منصوبے کے انکشاف کے بعد اگرچہ بہ ظاہر تحریک ریشمی رومال ختم ہوگئی لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت میں کوئی کمی نہیں آئی، جب تک حیات رہے سوتے جاگتے آزادی کا خواب دیکھتے رہے، حضرت شیخ الہندؒ کے بعد ان کے باکمال شاگردوں نے اس خواب کو حقیقت کا لباس پہنانے میں رات دن ایک کردیا، افسوس آزادی کے بعد جو لوگ اقتدار میں آئے انہوں نے مسلمانوں کی ان تحریکوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا، آج کتنے لوگ ہیں جو حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی تحریک ریشمی رومال سے واقف ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو علماء دیوبند کے خون سے رنگین اس داستانِ آزادی سے باخبر ہیں؟

(۱) نقش حیات ج ۲ ص ۲۳۳۔ (۲) تاریخ دیوبند ص ۲۳۴۔

جمعیۃ علماء ہند اور تحریک آزادی

خلافت کمیٹی کا قیام:

پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا، اس صورت حال سے ہندوستان کے مسلمان پریشان ہوگئے کہ اگر اس جنگ میں برطانیہ کو کامیابی ملی تو وہ ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا، اور خلافتِ اسلامیہ کے خاتمے کی کوشش کرے گا جس کا مرکز اس وقت ترکی تھا، مسلمانوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کے لیے اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج کے سامنے یہ شرط رکھی کہ جنگ کے دوران مسلمانوں کے مقامات مقدس کی بے حرمتی نہیں ہوگی اور جنگ کے بعد مسلمانوں کی خلافت محفوظ رہے گی، لائیڈ جارج نے ان دونوں شرطوں سے اتفاق کیا۔

اس جنگ میں جرمنی کو شکست اور برطانیہ کو فتح ہوئی، جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اپنی فوجیں بصرہ اور جدہ میں داخل کردیں، ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کو ان کا وعدہ یاد دلانے کے لیے اور خلافت کے تحفظ کے لیے تحریک خلافت کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے ۵/ جولائی ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی قائم کی۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں منعقد ہوا، جس میں مہاتما گاندھی نے بھی شرکت کی اور خلافت تحریک کی مکمل تائید کی، ان دنوں حضرت شیخ الہندؒ مالٹا کی جیل میں تھے، سفر حجاز کے دوران تین ریشمی خطوط پکڑے جانے پر انگریزوں نے شریف مکہ کے ذریعے حضرت شیخ الہندؒ کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کرکے انگریزوں کی تحویل میں دے دیا، یہ

۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے، حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کی خبر ہندوستان پہنچی تو ملک بھر کے مسلمان بطور خاص آپ کے شاگرد اور معتقدین بے چین ہو اٹھے، اس مقصد کے لیے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے ''انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام'' قائم کی، جس کے پلیٹ فارم سے اس واقعے کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔

جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس:

۱۹۱۹ء میں جب خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دہلی میں ہوا تو اس میں علماء کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور طے کیا کہ جمعیۃ علماء ہند کے نام سے علماء کی ایک باضابطہ جماعت بنائی جائے، ۳۰/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کمیٹی کے دوسرے اجلاس بمقام امرتسر کے موقع پر جمعیۃ علماء کا بھی اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ نے کی، اس میں ایک مسودۂ دستور پیش کیا گیا اور مجلس منتظمہ بنائی گئی، صدارت کی ذمہ داری حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے سپرد کی گئی اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کو ناظم عمومی منتخب کیا گیا۔

ترکِ موالات:

اس واقعے کے کچھ ماہ بعد ۸/ جون ۱۹۲۰ء کو تین سال کی اسارت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہوکر ہندوستان پہنچے تو بمبئی کے ساحل پر ہزاروں افراد نے آپ کا استقبال کیا، استقبال کرنے والوں میں مہاتما گاندھی، مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ، دار العلوم دیوبند کے مہتمم حافظ محمد احمد صاحبؒ جیسی شخصیتیں بھی تھیں، ۹/ جون کو خلافت کانفرنس نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں تحریکِ ترکِ موالات کا فیصلہ کیا، مہاتما گاندھی کو اس کا رہ نما مقرر کیا گیا، اس تحریک کے اہم پہلو یہ تھے۔

۱- حکومت کے خطابات واپس کردیے جائیں۔
۲- کونسلوں کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جائے۔
۳- سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کرلی جائے۔
۴- تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کردیں۔

۵- مقدمات سرکاری عدالتوں میں نہ لے جائے جائیں۔
۶- انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

مالٹا سے واپس آتے ہی ضعف ونقاہت کے باجود حضرت شیخ الہندؒ اس کام کی طرف متوجہ ہو گئے جس کو چھوڑ کر حجاز مقدس تشریف لے گئے تھے، یعنی حصول آزادی کی جدو جہد میں لگ گئے، خلافت کمیٹی نے ترک موالات کا فیصلہ کیا، حضرت شیخ الہندؒ نے اس فیصلے کی مکمل تائید کی اور اس کے حق میں ۱۹/ جولائی ۱۹۲۰ء کو ایک فتوی جاری کیا جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طلبہ کے سوالات کے جواب میں لکھا گیا تھا، یہ فتوی بہت مفصل اور آیات قرآنیہ سے مدلل ہے بعد میں حضرت شیخ الہندؒ کا یہ فتوی مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے ''جمعیۃ علماء ہند کا متفقہ فتوی'' کے نام سے مرتب فرما کر شائع کر دیا، اس پر تقریباً پانچ سو علماء کے تائیدی دستخط ثبت ہیں، پھر جمعیۃ علماء ہند کا خصوصی اجلاس ۶/ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا، اس میں شریک دوسو علماء نے بھی ترک موالات کے اس فتوے کی مکمل تائید کی، اس طرح جمعیۃ علماء ہند نے منظم طور پر حصول آزادی کے لیے اپنی جدو جہد کا سلسلہ شروع کیا۔

طریقۂ جنگ میں تبدیلی:

اب تک ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جو بھی تحریکیں چلیں ان میں تشدد، جنگ اور طاقت کے استعمال کا پہلو نمایاں رہا ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے مالٹا سے واپسی کے بعد یہ محسوس کیا کہ اب انگریزوں سے طاقت کے بل پر جنگ کرنی مشکل ہے، اس جنگ کو دستوری اور آئینی شکل دے کر عدم تشدد کا راستہ اپنانا چاہئے، اور اس سفر میں برادران وطن کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہئے، ترکِ موالات کی تائید وتوثیق میں اسی احساس کو عملی شکل دی گئی ہے، جمعیۃ علماء ہند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے مربی وسرپرست حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز کردہ عدم تشدد کی راہ کو کامیابی کے ساتھ اپنایا، حالاں کہ انگریزوں نے اکابرین جمعیۃ کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھی ڈالا مگر انھوں نے یہ راستہ ترک نہیں کیا، ورنہ حصول آزادی کی راہ طویل تر اور دشوار ترین بھی ہو سکتی تھی۔

جمعیۃ کا دوسرا اجلاس عام اور حضرت شیخ الہندؒ کا خطبۂ صدارت:

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس عام ۱۹/ ۲۰/ ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا، اجلاس کی صدرات کے لیے حضرت شیخ الہندؒ سے درخواست کی گئی تھی اور آپ نے منظور بھی فرمالی تھی، آپ ان دنوں دہلی میں ڈاکٹر مختار انصاری کی کوٹھی پر تشریف فرما تھے، لیکن عین اجلاس کے موقع پر بیماری، ضعف اور نقاہت میں اضافہ ہو گیا، جس کی وجہ سے آپ کے لیے جلسے میں شرکت کرنا ممکن نہ رہا، اس لیے آپ کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے خطبۂ صدارت پڑھا، پورا خطبۂ صدارت حضرت شیخ الہندؒ کے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو انگریزوں کے خلاف آپ کے دل میں ہمہ وقت موجزن رہتے تھے، جوشِ جذبات کا عالم یہ ہے جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور لاوے نے الفاظ کا روپ دھار لیا ہو، اس خطبۂ صدارت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں ہندو اور مسلمان شانہ بہ شانہ ہو کر برطانوی حکومت کے خلاف متحدہ جدو جہد کریں، اگر دونوں قوموں میں اتحاد اور یگانگت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے تو انگریزوں کو اس ملک سے اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس عام میں ترکِ موالات کی مکمل تائید کی گئی، یہ علماء ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچ گئی، ہزاروں لوگوں نے سرکاری ملازمتوں سے استعفی دے دیا، برطانوی فیکٹریوں کی مصنوعات کا استعمال چھوڑ دیا، یہاں تک کہ لوگ کھدر کے کپڑے پہننے لگے جو ہندوستان ہی میں تیار کئے جاتے تھے، اسکولوں نے سرکاری امداد لینا بند کر دی، غرضیکہ ترکِ موالات کے فیصلے کا اس قدر اثر ہوا کہ برطانوی حکومت حواس باختہ ہو گئی، افسوس اس اجلاس کے ٹھیک ۹/ دن بعد ۳۰/ نومبر ۱۹۲۰ء کو امام انقلاب، قائد حریت حضرت شیخ الہندؒ دہلی میں انتقال فرما گئے، دیو بند میں اپنے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قدموں میں مدفون ہیں۔

ترکِ موالات کی پاداش میں گرفتاریاں:

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد اس تحریک کی آگ سرد نہیں ہوئی بلکہ اس میں کچھ اور شدت پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ خلافت کانفرنس کے اجلاس (جون ۱۹۲۱ء کراچی) میں یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت برطانیہ کے ساتھ موالات واعانت کے تمام تعلقات حرام ہیں، اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ ۳۱/ اگست ۱۹۲۰ء سے تحریکِ عدم تعاون پورے جوش وخروش کے ساتھ چلائی جائے گی، جمعیۃ علماء ہند کے اکابرین نے اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی، حکومت نے ترکِ موالات کا فتویٰ ضبط کرلیا، برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کرنے کے جرم میں کراچی کی عدالت میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸/ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے ہر اجلاس میں ترکِ موالات پر زور دیا، اور اس کو حصولِ آزادی کے لیے ایک بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، جس کا مسلمانوں پر اچھا اثر ہوا، حکومت برطانیہ بھی پریشان ہوگئی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، پیر غلام مجدد مرحوم اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو مرحوم کی گرفتاریاں اس کی اسی بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھیں۔

ترکِ موالات کی تحریک تین سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہی، اس کی بنیاد حضرت شیخ الہندؒ جیسے بزرگوں نے اور خود مہاتما گاندھی جیسے لیڈروں نے عدم تشدد پر رکھی تھی، اگر یہ تحریک اسی راستے پر چلتی رہتی تو شاید ملک وقوم کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا، لیکن بعض لوگوں کی نادانی سے یہ تحریک اپنی پٹری سے اتر گئی اور ناکامی کا شکار ہوگئی، ہوا یہ کہ اترپردیش کے ایک گاؤں چوراچوری کے لوگوں نے ۵/ فروری ۱۹۲۲ء کو خلافت کانفرنس اور ترکِ موالات کی حمایت میں مشتعل ہوکر ایک تھانے کو آگ لگادی جس میں ۲۲ سپاہی جل کر مر گئے، اس واقعے کو بنیاد بنا کر گاندھی جی نے اعلان کردیا کہ یہ تحریک عدم تشدد پر

باقی نہیں رہی اس لیے اسے ختم کیا جاتا ہے، گاندھی جی کے اس اعلان سے ترکِ موالات کے سلسلے میں لوگوں پر مایوسی طاری ہوگئی اور ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

ہندو مسلم اتحاد بھی ختم:

اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد بھی ختم ہوگیا، حالاں کہ خلافت کمیٹی کے اسٹیج پر جس طرح ہندو اور مسلمان اکٹھے ہوکر بیٹھے، اور جس طرح بمبئی پہنچنے پر حضرت شیخ الہندؒ کا سب نے مل جل کر استقبال کیا، اور ترک موالات کی تحریک کو جس طرح دونوں قوموں نے کندھے سے کندھا ملا کر چلایا اس سے ملک میں ہندو مسلم اتحاد قائم ہوگیا تھا، اور یہ اس ملک کے لیے نیک فال تھی، لیکن ایسا لگتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس اتحاد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، یا یہ اتحاد وقتی جذباتی اور اتنا سطحی رہا کہ گاندھی جی کے ایک اعلان نے پورے اتحاد کی مستحکم عمارت کو زمیں بوس کر ڈالا۔

انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک:

تحریک خلافت کے بعد ملک میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، حالاں کہ یہ دونوں قومیں صدیوں سے ایک ساتھ رہتی آئی تھیں، دوسری طرف شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوگئیں، شدھی تحریک کا مقصد پسِ ماندہ مسلمانوں کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر مسلمان بنانا تھا اور سنگھٹن کا مقصد ہندوؤں کو متحد کرنا تھا، ہندو مہاسبھا بھی ان تحریکوں کی پشت پر آگئی، یہاں تک بعض حلقوں کی طرف سے علی الاعلان یہ کہا جانے لگا کہ مسلمان ہندوستان میں غیر ملکی ہیں اگر واپس چلے جائیں تو بہتر ہے، اس پورے معاملے میں انگریزی حکومت نے ہندو تنظیموں کی پشت پناہی کی، لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپناتے ہوئے حکومت نے ہندوؤں کی بے جا طرف داری کی انتہا کردی، نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کردیا بلکہ ان کو جو مراعات حاصل تھیں وہ بھی ان سے چھین لیں، انگریزوں کی اس پالیسی کی وجہ سے مسلمان آہستہ آہستہ کاروبار وتجارت سے بھی باہر ہوتے چلے گئے، اور سماجی اعتبار سے بھی بچھڑ گئے، ان حالات میں جمعیۃ علماء ہند

نے ان تنظیموں کا بھرپور مقابلہ کیا، فتنۂ ارتداد سے مقابلے کے لیے ایک مستقل "شعبۂ تبلیغ وحفاظت اسلام" قائم کیا، علماء کی منظم اور بروقت کوششوں سے ہزاروں مسلمان دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

دوقومی نظریے کو فروغ:

یہ وہ حالات تھے جو دوقومی نظریے کی تخلیق کا سبب بنے، حالاں کہ یہ دونوں قومیں ہندوستان میں ہر جگہ صدیوں سے رہتی آئی تھیں، مسلم دورِ حکومت میں بھی رہیں، انگریزوں کے زمانے میں بھی رہیں، لیکن حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تفریق پیدا کرنی شروع کر دی، نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے خلاف کئی ہندو تنظیمیں کھڑی ہو گئیں، جو لوگ پُر امن طریقے پر زندگی گزار رہے تھے وہ باہم دست و گریباں ہو گئے، ایسے میں بعض مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے لیے الگ ملک کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا، جمعیۃ علماء ہند نے دوقومی نظریے کی مخالفت بھی کی اور علیحدہ ملک کے مطالبے کو بھی مسترد کیا، کیوں کہ جمعیۃ علماء ہند یہ سمجھتی تھی کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کا مطالبہ ان کی طاقت کو کمزور کر دے گا، اور اگر یہ مطالبہ منظور بھی ہو گیا تب بھی مسلمانوں کے حق میں اس کے نتائج بہتر ثابت نہیں ہوں گے۔

مکمل آزادی کا مطالبہ:

جمعیۃ علماء ہند وہ پہلی ملکی تنظیم ہے جس نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، اس سے پہلے جزوی آزادی کے مطالبات کئے جاتے تھے، چناں چہ کانگریس نے موتی لال نہرو کی سربراہی میں قائم ایک کمیٹی سے دستور ہند کا ایک مسودہ تیار کرایا تھا جس میں کامل آزادی سے بچتے ہوئے حکومت برطانیہ کے ماتحت رہ کر کچھ آئینی مراعات حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، جمعیۃ علماء نے اس کی سخت مخالفت کی اور اپنے اجلاس کلکتہ (منعقدہ ۱۱/۱۲ مارچ ۱۹۲۶ء) میں جس کی صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

کر رہے تھے، یہ تجویز منظور کی کہ ہم ہندوستان سے انگریزوں کے مکمل انخلاء سے کم پر راضی نہیں ہیں، اگلے سال ۲ تا ۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور میں اجلاس عام ہوا جس کی صدارت حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے فرمائی اس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ "آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ اپنی جدوجہد سے حاصل کی جاتی ہے" ان جرأت مندانہ تجاویز نے ایک بار پھر سرد ہوتی ہوئی تحریک آزادی میں گرمی شرر پیدا کر دی۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے دستور پر نظر ثانی اور اصلاحات کرنے کے عنوان سے سائمن کمیشن کے نام سے ایک کمیشن تشکیل دیا تھا، مقصد یہ تھا کہ آزادی کی جو تحریک چل رہی ہے اسے وقتی طور پر دبا دیا جائے، جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اسی اجلاس میں اس کمیشن کی بھی مخالفت کی اور اس کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز بھی منظور کی، چناں چہ یہ کمیشن ۳/ فروری ۱۹۲۸ء کو برطانیہ سے ہندوستان آیا لیکن ملک میں عدم تعاون کا ماحول دیکھ کر ایک ماہ کے بعد واپس چلا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے ٹھیک پانچ سال بعد انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اپنے اجلاس لاہور منعقدہ ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کامل آزادی کا مطالبہ رکھا، اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اگر کسی تنظیم نے سب سے پہلے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور اس کے لیے ماحول سازی کی وہ جمعیۃ علماء ہند ہے، انڈین نیشنل کانگریس کی اس تجویز کے بعد دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی اور باہمی تعاون کا ماحول پیدا ہوا جس نے آزادی کی تحریک کو جلا بخشی اور تقویت عطا کی۔

نمک سازی کی تحریک:

چناں چہ جب گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ اور نمک سازی کی تحریک مارچ ۱۹۳۰ء میں شروع کی تو اس میں جمعیۃ علماء ہند کے رہنماؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہ تحریک نمک پر ٹیکس لگائے جانے کی مخالفت میں شروع کی گئی تھی، عدم تشدد کی راہ اپناتے ہوئے گاندھی جی نے ہزاروں ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ احمد آباد سے سمندر کی طرف چار سو کلو میٹر کا سفر پیدل طے کیا، انگریزوں کی گرفت کو کمزور کرنے والی یہ ایک بہت بڑی تحریک تھی

جس میں انھوں نے اسی ہزار سے زیادہ لوگوں کو جیل بھیجا، اس تحریک میں شرکت کے جرم میں جمعیۃ علماء ہند کے تقریباً تمام اکابر شریک ہوئے اور انہیں گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا۔

سول نافرمانی کی تحریک:

۱۹۳۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی، ملک بھر میں لیڈروں اور عوام نے اپنی گرفتاریاں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا، جمعیۃ علماء ہند اپنے اجلاس امروہہ (منعقدہ ۱۹۳۰ء) میں کانگریس کے ساتھ تعاون کی تجویز پاس کر چکی تھی اس لیے جمعیۃ نے نہ صرف یہ کہ اس تجویز کی تائید کی بلکہ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا، چناں چہ سب سے پہلے جمعیۃ علماء کے صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے ایک لاکھ افراد کے جلسے کی قیادت کرتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور وہ اٹھارہ ماہ جیل میں رہے، بعد کے مرحلوں میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ وغیرہ حضرات نے بھی گرفتاری دی، سول نافرمانی تحریک کے اس پورے مرحلے میں لگ بھگ نوے ہزار لوگوں کو جیل بھیجا گیا جن میں پنتالیس ہزار افراد مسلمان تھے، اس تحریک میں مسلمانوں کی شرکت جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کے نتیجے میں تھی۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء:

ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ تحریکوں نے حکومتِ برطانیہ کو ہلا کر رکھ دیا، انگریز سمجھ چکا تھا کہ اب آزادی کی آندھی چل پڑی ہے، اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے، وہ یہ محسوس کر چکا تھا کہ جبر و تشدد کے ساتھ اس ملک پر حکومت نہیں کی جا سکتی اور نہ اب ہندوستانیوں کی مرضی کے علی الرغم یہاں رہا جا سکتا ہے، اس لیے اس نے ایک ایکٹ بنا کر نافذ کیا، اس ایکٹ کو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کہا جاتا ہے۔

اس دستور کی رو سے ہندوستانیوں کو قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعے کچھ داخلی اختیارات دئے گئے تھے، مگر ان اسمبلیوں کی تشکیل الیکشن کے ذریعے ہونی تھی، انگریزوں

نے الیکشن کا نظام مذہبی تفریق کی بنیاد پر بنایا جس سے ملک کی دونوں قوموں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تفریق کی خلیج مزید گہری ہوگئی، انگریزوں کا بنایا ہوا نظام یہ تھا کہ ہندو صرف ہندو امیدواروں کو اور مسلمان صرف مسلم امیدواروں کو ووٹ دیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے اس دستور میں ترمیم کا ایک مسودہ بھی حکومت کو پیش کیا جس کو مدنی فارمولا کہا جاتا ہے، اس فارمولے میں جو تجاویز تھیں اگر ان پر عمل کیا جاتا تو ملک بھی تقسیم نہ ہوتا اور مسلمانوں کے مسائل بھی کما حقہ حل ہو جاتے، لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے اس فارمولے کو من وعن قبول نہیں کیا بل کہ اس کے بعض اجزاء قبول کئے اور بعض مسترد کر دئے۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ:

انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے نتیجے میں الیکشن ہوئے تو اس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حصہ لیا، کئی صوبوں میں مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اور اس نے حکومت بنائی، کئی صوبوں میں کانگریس نے حکومت بنائی اور مسلم لیگ دوسرے نمبر پر رہی، اگر حکومت سازی کے عمل میں یہ دونوں پارٹیاں اشتراک عمل کرتیں تو بہت ممکن تھا حالات درست رہتے اور تقسیم ملک کی نوبت نہ آتی، لیکن کانگریس میں شامل بعض سخت گیر اور متشدد قسم کے افراد نے مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا، جس سے مسلم لیگ مشتعل ہوگئی اور اس نے اپنی پوری طاقت کانگریس کی مخالفت میں لگا دی، کیوں کہ جمعیۃ علماء ہند کانگریس کی حلیف رہی تھی اس لیے مسلم لیگ کی طرف سے اسے بھی نشانہ بنایا گیا، اس طرح دو بڑی جماعتوں میں اختلاف ہو گیا اور تمام ہندوستانی مسلمان دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے، اور کوشش کے باوجود یہ دونوں جماعتیں کبھی ایک نہ ہو سکیں۔

دوسری جنگ عظیم:

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی، جرمنی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ

کردیا، حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ جرمنی کے خلاف اس جنگ میں ہندوستانی عوام برطانیہ کا ساتھ دیں، اس کے لیے حکومت نے اپنی فوج میں جبری بھرتی کا سلسلہ شروع کردیا جس کے نتیجے میں تقریباً دولاکھ افراد جنگی محاذوں پر لقمۂ اجل بن گئے، ہندو اور مسلم دونوں لیڈروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور تمام کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا، حکومت ہر قیمت پر ہندوستانیوں کا تعاون چاہتی تھی اس کے لیے وہ مزید رعایتیں دینے پر بھی آمادہ تھی، مگر کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند دونوں نے اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، جمعیۃ علماء نے اپنے اجلاس جون پور (منعقدہ جون ۱۹۴۰ء) میں یہ قطعی اعلان کردیا کہ ہم جنگ میں حکومت برطانیہ کا ساتھ نہیں دیں گے، اسی کے ساتھ جمعیۃ نے کامل آزادی کا اپنا مطالبہ بھی دوہرایا اور انگریزوں کے مکمل بائیکاٹ کی تجویز بھی منظور کی۔

جمعیۃ علماء کو اپنے اس موقف کی قیمت بھی چکانی پڑی، اس کے مختلف قائدین کو گرفتار کیا گیا جرمنی اور برطانیہ کے درمیان یہ جنگ پانچ سال تک جاری رہی اور ساڑھے پانچ کروڑ لوگ اس کے نتیجے میں ہلاک ہوئے۔

کوئٹ انڈیا تحریک:

کوئٹ انڈیا، بھارت چھوڑو آندولن، یا ہندوستان چھوڑو تحریک ہندوستان میں چلنے والی ایک اہم تحریک ہے جس کا آغاز مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۲ء میں کیا تھا، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ سول نافرمانی کے ذریعے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے، اس سلسلے میں کانگریس نے احتجاجی ریلیاں نکالیں اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ فی الفور ہندوستان خالی کردیں، جمعیۃ علماء ہند نے اس تحریک میں کانگریس کے ساتھ مکمل تعاون کیا، ۵/ اگست ۱۹۴۲ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے چار اہم اراکین حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ نے ایک سخت بیان جاری کیا جس میں مہاتما گاندھی کے مطالبے کی تائید کرتے ہوئے کہا گیا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دے، اس کے بعد ۸/ اگست کو جمعیۃ علماء نے اپنے بمبئی اجلاس میں اسی مضمون کی ایک تجویز بھی پاس کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس کے

قائدین کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے متعدد رہنماؤں اور ہزاروں کارکنوں کو حکومت نے گرفتار کرلیا، ان اندھادھند گرفتاریوں کے نتیجے میں پورا ملک شورش کا شکار ہوگیا، پورے ملک میں بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، عوام سڑکوں پر نکل آئے، انھوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں، بجلی کا نظام معطل کردیا، سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا، حکومتی دفاتر، کچہریوں، عدالتوں اور پولیس اسٹیشنوں کو نذر آتش کردیا، سفید فاموں پر حملے کیے، دو ہفتے تک سارا نظام حکومت معطل رہا، پولیس بے بسی کے ساتھ تماشا دیکھتی رہی، اس کے بعد پولیس نے سخت ایکشن لیا، بھیڑ پر گولیاں چلائیں جس سے سینکڑوں لوگ ہلاک ہوگئے، اس طرح اس تحریک کا زور کم ہوا، ۱۹۴۴ء میں نیا وائسرائے مقرر ہوکر ہندوستان آیا تو اس نے تمام گرفتار شدہ رہنماؤں کی رہائی کے احکام دئے۔

تقسیم ہند کی مخالفت:

ان حالات میں جب یہ یقینی ہوگیا کہ اب انگریز اس ملک سے جانے والے ہیں، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ہی تقسیم ملک پر بہ ضد تھے، صرف جمعیۃ علماء ہند واحد ایک ایسی جماعت تھی جس نے تقسیم ہند کی بھرپور مخالفت کی، جمعیۃ علماء مکمل آزادی تو چاہتی تھی لیکن اسے یہ منظور نہ تھا کہ آزادی کے نتیجے میں ملک دو ٹکڑوں میں بٹ جائے، البتہ وہ ایسا نظام حکومت چاہتی تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک ہوں، اور کسی فریق کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اس سلسلے میں جمعیۃ علماء نے اپنے اجلاس سہارن پور میں ایک چھ نکاتی فارمولہ بھی منظور کیا، افسوس حکومت برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں نے اس فارمولے کو مسترد کردیا، اگر وہ فارمولہ منظور ہوجاتا اور اس کی بنیاد پر نظام حکومت تشکیل پاتا تو آج پاکستان اور بنگلا دیش موجود نہ ہوتا اور ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں مل کر حکومت کا نظم ونسق چلاتے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تفصیلات کے لیے دیکھئے (۱)۔

(۱) جمعیۃ علماء کیا ہے (۲) تحریک آزادی میں علماء اور عوام کا کردار۔

یوم جمہوریت

۲۶/ جنوری کی تاریخ آزاد ہندوستان میں نہایت اہمیت کی حامل ہے، اس دن وہ برطانوی ایکٹ منسوخ کیا گیا جو ۱۹۳۵ء سے نافذ تھا اور اس کی جگہ خود ہندوستانیوں کا بنایا ہوا دستور نافذ ہوا، ہر سال آج کے دن دلی سمیت پورے ملک میں شاندار تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے، دہلی میں یہ تقریب راج پتھ پر منعقد کی جاتی ہے جس میں صدر جمہوریہ ہند بہ نفس نفیس شرکت کرتے ہیں، ان کے ساتھ کوئی غیر ملکی شخصیت بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوتی ہے، وزیر اعظم سمیت حکومت کے تمام وزراء، ممبران پارلیمنٹ غیر ملکی سفارت کار اور بے شمار اہم شخصیات اس تقریب میں موجود ہوتی ہیں، تینوں افواج کے منتخب دستے صدر جمہوریہ کو سلامی پیش کرتے ہیں، اور تمام صوبوں کی جھانکیاں صدر کے سامنے سے گزرتی ہیں، کئی کلومیٹر لمبے راستے کے دونوں طرف عوام کا جم غفیر کھڑا ہو کر فوجی دستوں کا اور جھانکیوں کا جوش وخروش کے ساتھ تالیاں بجا کر استقبال کرتا ہے، اس موقع پر رنگارنگ ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں، غرض یہ کہ یہ ایک یادگار تقریب ہوتی ہے جسے ہر سال گذشتہ سالوں کے مقابلے میں خوب صورت اور پُر اثر بنانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

اس دن کی اہمیت یہ ہے کہ آج سے 67 سال سے پہلے آج ہی کی تاریخ یعنی ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس ملک کا دستور نافذ کیا گیا تھا، یہ دستور کیبنٹ مشن پلان ۱۹۴۶ء کے تحت وجود میں آئی؛ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے بنایا گیا تھا، اس کو وضع کرنے سے نافذ کرنے تک تین سال کا وقت اور ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا، پہلے غیر منقسم ہندوستان میں

الیکشن کے ذریعے دوسو بانوے نمائندوں کا انتخاب عمل میں آیا، دوسو آٹھ نمائندے کانگریس کے اور تہتر نمائندے مسلم لیگ کے منتخب ہوئے، ترانوے نمائندے نوابین اور راجاؤں کی طرف سے نامزد کیے گئے، اس طرح کل تین سو ترانوے نمائندوں سے یہ اسمبلی وجود میں آئی، ۹/ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا، جس میں سب سے معمر رکن اسمبلی ڈاکٹر سچدانند سنہا کو اس اسمبلی کا عارضی صدر منتخب کیا گیا، ۱۱/ ستمبر کو تمام اراکین نے اتفاق رائے سے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اسمبلی کا مستقل چیئرمین بنایا، اسمبلی نے آئین سازی کے لیے ۱۳/ کمیٹیاں بنائیں، ان کمیٹیوں نے اپنے اپنے مسوّدات تیار کیے، بعد میں ایک سات رکنی ڈرافٹ کمیٹی نے جس کی صدارت ڈاکٹر امبیڈکر کر رہے تھے ان مسوّدات کے گہرے مطالعے کے بعد آئین کا نیا مسوّدہ تیار کیا، ۴/ نومبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسوّدۂ آئین بحث ونظر ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافے کے لیے آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا، جنوری ۱۹۴۸ء کو یہ مسوّدہ عام لوگوں کے لیے شائع کر دیا گیا، ترمیم وتنسیخ کے لیے دو ہزار سے زیادہ تجاویز موصول ہوئیں، ۲۶/ نومبر ۱۹۵۰ء کو مسوّدۂ آئین دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوا، اور ایک کے علاوہ تمام اراکین نے ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کے اجلاس میں اس کی ہندی اور انگریزی کاپیوں پر دستخط کر کے اسے سندِ قبولیت سے سرفراز کیا، صرف مولانا حسرت علی موہانیؒ نے لکھا کہ ''یہ آئین برطانوی دستور کی نئی توسیع شدہ شکل ہے، اس سے آزاد ہندوستانیوں کا اور آزاد ہندوستان کا مقصد پورا نہیں ہوتا''۔

ہندوستان کے آئین کی بنیاد انصاف اور مساوات پر قائم ہے، اس کے ابتدائیہ میں کہا گیا ہے کہ اس آئین کی رو سے ہندوستان خود کو آزاد، سماج وادی اور جمہوری ملک قرار دیتا ہے، اس کے ذریعے تمام شہریوں کے لیے معاشی، سماجی اور سیاسی انصاف بروئے کار لایا جائے گا، اظہار خیال کی آزادی، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی دی جائے گی، مواقع اور معیار میں مساوات قائم کی جائے گی، انفرادی تشخص اور احترام کو یقینی بنایا جائے گا اور ملک کی سالمیت اور یک جہتی کو باقی رکھا جائے گا۔

آئین سازوں نے آئین سازی کے عمل سے پہلے دوسرے ملکوں کے بالخصوص امریکہ، برطانیہ، کناڈا وغیرہ کے دستوروں کا بہ غور مطالعہ کیا اور ان کی روشنی میں یہاں کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنا آئین مرتب کیا۔

۱۹۵۰ء میں منظور ہونے والے دستور ہند میں بائیس ابواب ۱۲ اشڈیول اور ۳۹۵ دفعات تھیں، اس وقت سے اب تک اس دستور کی متعدد دفعات ختم کردی گئی ہیں اور اس میں متعدد دفعات کا اضافہ کردیا گیا ہے، کوئی بھی برسر اقتدار پارٹی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری سے کسی دفعہ کو ختم کرنے اور کسی دفعہ کا اضافہ کرنے کا حق رکھتی ہے، ہمارا اصل آئین فن کاروں کے ذریعے سجائے گئے اوراق پر ہاتھ سے لکھا ہوا محفوظ ہے، اگرچہ یہ ایک مضبوط دستاویز ہے، لیکن برسراقتدار پارٹی اپنی دوتہائی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی وقت اس دستور میں ترمیم کرسکتی ہے، صدر جمہوریۂ ہند کی منظوری کے بعد یہ ترمیم مستقل قانون کی شکل اختیار کرلیتی ہے، بعض اوقات صدارتی حکم ناموں کے ذریعے بھی آئین میں تبدیلی کردی جاتی ہے، بعد میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اس کی توثیق کردیتے ہیں، ہمارے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں، ہمارے آئین میں دفعہ ۳۴۱ موجود ہے، جس میں نفاذِ دستور کے محض آٹھ مہینوں کے بعد صدارتی حکم نامے کے ذریعے یہ ترمیم کی گئی کہ ریزرویشن سے صرف ہندو دلت اور ہریجن فائدہ اٹھا پائیں گے، بعد میں اس دفعہ میں ایک اور ترمیم کی گئی، اور اس میں بودھ اور سکھ کا اضافہ کردیا گیا، اس طرح دستور کی تمہید میں معاشی برابری کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ اس ترمیم کے ذریعے ختم ہوگیا، آج بھی ہندوؤں کی بہت سی برادریوں کے لیے ملازمتوں وغیرہ میں تحفظات موجود ہیں، مسلمان عرصے سے اپنے لیے ریزرویشن کا مطالبہ کرتے آرہے ہیں مگر ان کو دستور کا حوالہ دے کر خاموش کردیا جاتا ہے۔

دستور میں ترمیم کی ایک مثال شاہ بانو کیس بھی ہے، جب ملک کی اعلا ترین عدالت کا ایک فیصلہ پارلیمنٹ کے ذریعے تبدیل کردیا گیا تھا، اس وقت راجیو گاندھی ملک

کے وزیر اعظم تھے، مگر مسلمانوں کو اس تبدیلی کی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی، ایک طرف راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ کے ذریعے عدالتی فیصلہ کالعدم قرار کروایا، دوسری طرف ناراض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر بابری مسجد کا تالہ کھلوادیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت تو کانگریس برسر اقتدار آگئی مگر بعد میں بی جے پی کو بابری مسجد پر اپنی سیاست چمکانے کا موقع مل گیا، آج بی جے پی جو کچھ بھی ہے وہ بابری مسجد کی شہادت کی وجہ سے ہے۔

آج کل لوک سبھا میں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہے، اگر راجیہ سبھا میں بھی اس کی اکثریت ہوتی تو وہ اب تک دستور کی کئی دفعات میں ترمیم کرچکی ہوتی، خاص طور پر دفعہ ۳۷۰ میں جس کا تعلق کشمیر سے ہے، بی جے پی نے ۲۰۱۴ء کے الیکشن میں عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ برسر اقتدار آئی تو دفعہ ۳۷۰ کو ختم کردے گی جس کے ذریعے کشمیر کو خصوصی درجہ ملا ہوا ہے، دوسرا وعدہ اس نے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا کیا تھا، دراصل اس دستور میں دفعہ ۴۴ رکھی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ملک کے تمام شہریوں کو یکساں سول کوڈ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ماحول سازی کرتی رہے“ مسلمانوں کو یہ خوف ستاتا رہتا ہے کہ اگر بی جے پی کو دونوں ایوانوں میں مکمل اکثریت حاصل ہوگئی تو وہ دفعہ ۴۴ کا سہارا لے کر ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرسکتی ہے۔

آج کل ملک میں تین طلاق کے مسئلے کو لے کر بڑا گرم ماحول ہے، ملک کی مختلف عدالتیں تین طلاقوں کے خلاف اپنی رائے ظاہر کرچکی ہیں، معاملہ سپریم کورٹ میں ہے، کئی مسلم تنظیمیں اس کیس کی پیروی کررہی ہیں، حکومت کی کوشش ہے کہ کسی طرح وہ عدالت عالیہ کے ذریعے تین طلاق کا قانون ختم کرادے جب کہ اس کا تعلق مسلم پرسنل لاء سے ہے اور دفعہ ۲۵ کے ذریعے ہر طبقے کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ملی ہوئی ہے، اگر سپریم کورٹ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیتا ہے تب بھی بی جے پی خاموش بیٹھنے والی نہیں ہے، فی الحال راجیہ سبھا میں اس کی اکثریت نہیں ہے جس سے اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں، جیسے ہی اسے مطلوبہ اکثریت حاصل ہوگی وہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش

ضرور کرے گی۔

ہندوستان کے آئین سازوں نے تو بہ ہر حال ملک کو ایک مکمل اور خوب صورت دستور دینے کی کوشش کی ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اس کی خوب صورتی کو برقرار رکھ کر ان کی محنتوں کو رائگاں نہ جانے دیں، لیکن سیاسی پارٹیاں نہیں چاہتیں کہ اس دستور کا حسن برقرار رہے وہ اپنے حقیر مفادات کے لیے اس کی روح ختم کرنے کے چکر میں پڑی ہوئی ہیں، خدا کرے یہ ملک اپنے خوب صورت دستور کے سائے میں اسی طرح پروان چڑھتا رہے، اقلیتوں کے لیے تسلی کی بات یہ ہے کہ اس ملک کا جمہوری نظام بڑا مضبوط ہے، خاص طور پر یہاں کی عدلیہ جس کے منصفانہ فیصلوں سے بہت سے بے گناہ مسلم نوجوان جیل کی سلاخوں سے نکل کر آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، بل کہ بہت سے تو سزائے موت کے فیصلوں کو عدالتوں میں شکست دے کر زندگی کی بازی جیتے ہیں، عدالتی نظام کو یہ بڑے اختیارات اور تحفظ اسی دستور نے دیا ہے، اسی طرح ہمارے ملک کا الیکشنی نظام بھی ہمارے لیے بڑا مضبوط سہارا ہے، ہر پانچ سال کے بعد برسر اقتدار پارٹی دوبارہ حکومت میں آنے کے لیے عوام کا ووٹ حاصل کرنے پر مجبور ہے، عوام چاہیں تو اسے اگلے پانچ سال کے لیے دوبارہ اقتدار سونپ سکتے ہیں اور چاہیں تو اسے اقتدار سے بے دخل بھی کر سکتے ہیں، الیکشن کا یہ مضبوط نظام بھی اسی دستور کی دین ہے، اقلیتوں کے لیے عدالتی اور الیکشنی نظام دو ایسی پناہ گاہیں ہیں جہاں پہنچ کر وہ اپنا ہر زخم بھول جاتے ہیں اور دستور ہند کے معماروں کو سلام پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۲۶/جنوری: احتساب کا دن

ہم گذشتہ سرسٹھ سالوں سے ہر سال ۲۶/جنوری کا دن ''یوم جمہوریت'' کے عنوان سے مناتے ہیں، اس دن تمام سرکاری، غیر سرکاری کالج، اسکول، یونی ورسٹیز، دفاتر وغیرہ بند رہتے ہیں، ملک بھر میں سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر قومی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی جاتی ہے، قومی ترانہ پڑھا جاتا ہے، لوگ قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں، رنگا رنگ ثقافتی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، دھوئیں دار تقریریں ہوتی ہیں، جن میں جمہوریت کے فوائد گنائے جاتے ہیں، اس کے تحفظ کے عزم کا اعادہ کیا جاتا ہے، لیڈروں کی زبانیں یہ کہتے نہیں تھکتیں کہ ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے جہاں تمام مذاہب کے لوگ شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، جمہوریت کا مطلب اگر الیکشن ہے تو واقعی اس ملک کا کوئی ثانی نہیں، اس ملک کے کروڑوں لوگ ووٹ کی طاقت سے لیس ہیں، اور وہ اپنی اس طاقت کے ذریعے کسی بھی سیاسی پارٹی کو فتح وشکست سے ہم کنار کر سکتے ہیں، لیکن الیکشن سے ہٹ کر دیکھیں تو اس ملک میں اب ''جمہوریت'' کا لفظ بے معنی سا نظر آنے لگا ہے، ہمارے بزرگوں نے آزادی سے جمہوریت تک کا مشکل بھرا سفر اس لیے کیا تھا کہ اس ملک میں امن وسکون ہوگا، کسی کے ساتھ تفریق نہیں برتی جائے گی، ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے، مذہب کے نام پر قتل وغارت گری اور خوں ریزی نہیں ہوگی، کسان، مزدور، ہنر مند سب خوش حال ہوں گے، ہر بچے کو تعلیم کا حق حاصل ہوگا، عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیے جائیں گے، ان کو عزت واحترام اور تحفظ دیا جائے گا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتلایئے کہ ان میں سے

کیا چیز ہمیں حاصل ہے، مساوات، ترقی، امن وسکون، خوش حالی، تعلیم، روزگار، عزت واحترام، تحفظ؟

۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ساز اسمبلی نے چار سال کی سخت محنت کے بعد ایک دستور مرتب کر کے منظور کیا، اور اسے عظیم جمہوریہ ہند کا دستور اساسی قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ اب ملک میں یہ دستور چلے گا، ملک کے ہر شہری کو اس دستور کی پابندی کرنی ہوگی۔ یوں تو ہمارے ملک کے دستور سازوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ دستور بنایا ہے، اس کو سیکولر ڈیموکریسی قرار دیا ہے، کیوں کہ یہاں ہر مذہب کے لوگ رہتے ہیں، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، دستور سازوں نے اسے ایک غیر مذہبی اسٹیٹ قرار دیا، مقصد یہ تھا کہ یہاں کی حکومت پر کسی مذہب کا رنگ غالب نہ ہو، مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے، اور اس معاملے میں اس کو مکمل آزادی حاصل ہو، اس ملک سے پاکستان کے نام پر جو حصہ الگ ہوا اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دیا، لیکن کیوں کہ جتنے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ کیا تھا اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں نے اس ملک میں رہنے کو ترجیح دی، آج بھی پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس وقت کے رہ نماؤں نے مسلمانوں کے جذبات اور ہندوستان کی آزادی میں ان کی گراں قدر خدمات اور ملک سے ان کی محبت اور وفاداری کا خیال رکھتے ہوئے اسے ایک ایسا دستوری تحفظ عطا کیا کہ یہ ملک کسی مذہب کے حوالے سے نہ پہچانا جائے۔

۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو جو دستور نافذ ہوا اس میں یہاں کے ہر شہری کو بنیادی حقوق دئے گئے ہیں، جیسے آزادی اور مساوات۔ یہ دونوں لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑی وسعت رکھتے ہیں، آزادی میں ہر طرح کی آزادی ہے، رہنے کی آزادی، کمانے اور کھانے پینے کی آزادی، سماجی اور معاشرتی آزادی، مذہبی آزادی، یہی حال مساوات کا ہے، یہ بھی اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے بڑا وسیع ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ باشندگان ملک کو ہر معاملے میں مساوات اور برابری حاصل ہو۔

افسوس اس ملک کے معماروں نے، ہندوستان کو سیکولر جمہوریہ بنانے والوں نے تو

ملک کے ہر شہری کو دستور کا تحفظ دیا، برابری دی، آزادی دی، حقوق دئے، حصول انصاف، حصول تعلیم اور حصول معاش کے یکساں مواقع دئے، لیکن حکومتوں نے اپنی بدنیتی سے، اپنے حقیر مقاصد کی خاطر اس دستوری تحفظ کو برباد کر کے رکھ دیا، آج ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے وہ سب کے سامنے ہیں اور جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے وہ بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔

یوں تو اس ملک کی حکومتوں نے صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی ناانصافی نہیں کی ہے، بل کہ دوسرے طبقے بھی ناانصافیوں اور محرومیوں کا شکار ہوئے ہیں، جیسے ہریجن اور دوسری پس ماندہ اقوام، مہاتما گاندھی نے ان کے لیے بڑی جدوجہد کی، ان کی غربت اور افلاس دور کرنے کے لیے، ان کو تعلیمی دھارے میں لانے کے لیے، ان کو سماجی مساوات اور برابری دلانے کے لیے مہاتما گاندھی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر امبیڈکر جیسے لوگ بھی میدان عمل میں آئے، یہاں تک کے نفاذ آئین کے آٹھ ماہ کے اندر اندر انہیں سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن کی ضمانت بھی دی گئی، ان کے لیے گاؤں در گاؤں اسکول کھولے گئے، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ان کے لیے سیٹیں محفوظ کی گئیں، گاؤں، قصبات میں افتادہ زمینیں ان کو الاٹ کی گئیں، یہی وجہ ہے کہ آج دلت اس ملک کی مین اسٹریم میں شامل ہیں، سیاست سے لے کر حکومت تک، نجی کمپنیوں سے لے کر سرکاری ملازمتوں تک، اسکولوں سے لے کر یونی ورسٹیوں تک ہر جگہ دلت بھائی اپنا مقام رکھتے ہیں، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہیں ریزرویشن حاصل تھا۔

دوسری طرف مسلمان ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ان کا حال دلتوں سے بھی بدتر تھا اور اب بھی ان سے بدتر ہے، نہ ان میں تعلیم ہے، نہ ان کے پاس زمینیں ہیں، نہ باعزت روزگار ہے، غربت، افلاس، معاشی بدحالی اور جہالت ان کی شناخت اور پہچان بن گئی ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں کو بھی ریزرویشن ملتا ان کو بھی آگے بڑھانے اور اونچا اٹھانے کی کوشش کی جاتی، ان کو بھی ملازمتیں دی جاتیں، ان کو بھی افتادہ زمینیں الاٹ کی جاتیں، اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ زمینوں کی وجہ سے خوش حال تھے

زمین دارہ قانون لاکر ان سے زمینیں چھین لی گئیں، اور ان کو دیدی گئیں جو ان کے ملازم کی حیثیت سے ان زمینوں پر کاشت کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہے، اگر مدارس اور مکاتب نہ ہوتے تو یہ صورت حال اور خراب ہوتی، ان مدرسوں میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، نہ صرف یہ کہ تعلیم فری ہوتی ہے بل کہ طلبہ کے طعام و قیام اور لباس وغیرہ کے تمام مصارف بھی اہل خیر حضرات کے تعاون اور مدد سے مدارس ہی برداشت کرتے ہیں، اب رہی دنیاوی تعلیم تو مسلمان اپنے بچوں کو دنیوی تعلیم میں لگائیں یا روزگار کمانے میں لگائیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دکان پر، ہر کارخانے میں، ہر فیکٹری میں مسلمان بچے اور نوجوان کام کرتے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ رکشے، ریڑھے، ٹھیلے بھی مسلمان ہی چلاتے اور کھینچتے نظر آئیں گے، اگر کچھ بچے اسکول کی تعلیم حاصل بھی کر لیتے ہیں تو انہیں کالج پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے، کالج پہنچ گئے تو یونی ورسٹی کی شکل دیکھنی مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومتیں نہ مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا چاہتی ہیں اور نہ انہیں معاشی طور پر خود کفیل بنانا چاہتی ہیں، ویسے تو ہر حکومت میں اقلیتوں کی مخصوص وزارت ہوتی ہے، اس وزارت کے تحت اقلیتوں کی مالی مدد کے لیے بڑے بڑے منصوبے تیار ہوتے ہیں، لیکن اکثر منصوبے صرف کاغذ پر ہوتے ہیں، اور اگر کسی منصوبے پر عمل بھی ہو جائے تو اس کا فائدہ مسلمانوں تک ان کی بے خبری اور پست ہمتی کی وجہ سے یا منصوبہ سازوں کی بدنیتی کی وجہ سے کم ہی پہنچتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی قسمت میں صرف محرومی ہے، اوپر سے فسادات کی مار رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہے، آزادی سے لے کر اب تک اس ملک میں ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں، ان میں بعض فسادات کو فساد کہنے کے بجائے منظم نسل کشی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے، گودھرا، گجرات کی مثال ہمارے سامنے ہے، جہاں نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، ان کی دکانیں لوٹیں گئیں، کاروبار برباد کئے گئے، مکانوں کو آگ لگائی، مظفر نگر ضلع کی تباہی کا زخم بھی ابھی تازہ ہے، وہاں مسلمانوں کو منصوبہ بند طریقے سے اجاڑنے اور

تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی، آج بھی ہزاروں خاندان اپنی زمینیں، دکانیں، مکانات چھوڑ کر نو آباد کالونیوں میں بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں، تباہی کی یہ خونچکاں داستان اتنی المناک ہے کہ یہ چند سطریں اس کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتیں۔

جب یوم جمہوریت آتا ہے اور ہر سال آتا ہے تو ہم خوشی اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس دن کا استقبال کرتے ہیں، خوشی تو یہ ہے کہ ہم بہ ہر حال اپنے بزرگوں کی قربانیوں کے طفیل آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہیں، خوشی اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ آزادی کے ساتھ ساتھ ہم ایک جمہوری ملک میں زندگی گزار رہے ہیں، خوشی اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک جمہوری نظام کے ساتھ ساتھ ایک سیکولر دستور بھی عطا کیا ہے، لیکن مایوسی اس وقت ہوتی ہے جب ہم خود کو آزادی کے ثمرات سے محروم پاتے ہیں، جمہوریت نے جو حقوق ہمیں بخشے ہیں ہم انھیں کتابوں میں تو پڑھتے ہیں، اپنے لیڈروں کی تقریروں میں تو سنتے ہیں لیکن ان پر عمل ہوتا ہوا نہیں دیکھتے۔

ہمارے قائد اور لیڈر، ہمارے حکمراں اور اصحاب اقتدار آج کے دن خوشی ضرور منائیں، جھنڈے لہرائیں، سلامی دیں، اور سلامی لیں، رقص و سرود کی محفلیں سجائیں، ضرور سجائیں لیکن ذرا احتساب بھی کر لیں کہ کیا یہ ملک ایک بڑے طبقے کو نظر انداز کر کے، اسے پس ماندہ رکھ کر اس کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کر کے ترقی کر سکتا ہے؟

مسلمانوں کو بھی زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کا ملک ہے، اس مٹی سے وفاداری ان کی سرشت میں داخل ہے، ان کے بزرگوں نے اس ملک کے گیسوئے برہم سنوارنے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے، اس ملک کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کے لیے ان کے اسلاف کی قربانیوں کی ایک لمبی داستان ہے، وہ اس ملک کے جمہوری نظام پر یقین رکھیں، اس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں، ایک نہ ایک دن ناانصافیوں کی یہ رات ضرور ختم ہوگی اور اس کے پہلو سے انصاف اور مساوات کا سورج ضرور طلوع ہوگا، بس ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی ضرورت ہے، محرومیوں کے صحراء میں یہ نظام ہی ہمارے لیے ایک شجر امید کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کے چار ستون

جمہوریت بہ ہر حال ڈکٹیٹر شپ سے بہتر ایک نظام حکومت ہے، اگر چہ اسلام جمہوریت کا نہ کلی طور پر حامی ہے اور نہ کلی طور پر اس کا مخالف، یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے، اس پر کسی اور موقع پر بات کریں گے، فی الحال ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں، جمہوریت کی عمارت چار ستونوں پر قائم ہوتی ہے، اگر ان میں سے ایک ستون بھی کمزور پڑ جائے تو پوری عمارت کو گرنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے، وہ چار ستون ہیں:

۱- مقننہ (پارلیمنٹ)

۲- انتظامیہ (گورنمنٹ)

۳- عدلیہ (جیوڈیشری)

۴- ذرائع ابلاغ (میڈیا)

جمہوریت کے قیام اور اس کی بقا میں یہ چاروں ادارے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اور ہر کردار اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے، دنیا میں جہاں جہاں بھی جمہوریت ہے، وہاں یہ چاروں ادارے مؤثر طریقے پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں، جہاں بھی ان میں سے کوئی ادارہ کمزور پڑتا ہے وہاں جمہوریت کمزور پڑ جاتی ہے بل کہ بعض اوقات تاناشاہی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کہتے ہیں کہ امریکہ اور یورپین ممالک میں جمہوریت پھل پھول رہی ہے کیوں کہ وہاں ان چاروں میں سے ہر ادارہ مضبوط اور مستحکم ہے، ایشیا کے بعض ممالک میں جمہوریت مذاق بن کر رہ گئی ہے، مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، عوام کے ذریعے منتخب حکومت فوجی حکمرانوں کے ذریعے ختم کر دی گئی، اور منتخب صدر کی جگہ فوجی جنرل خود

صدر بن بیٹھا، بعد میں رائے شماری کا ڈرامہ کیا گیا، عدلیہ، مقننہ، اور میڈیا سب جمہوریت کے نام پر ڈکٹیٹر شپ کی تائید کرتے نظر آئے۔

ہندوستان میں ابھی جمہوریت اتنی پختہ اور مضبوط نہیں ہے جتنی یورپ اور امریکہ میں ہے، اور اتنی کمزور بھی نہیں ہے جتنی مصر اور بعض دوسرے اشیائی ممالک میں ہے، ہندوستانی جمہوریت کو ابھی استحکام کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ان میں سے ہر ادارہ اپنی جگہ مضبوط و مستحکم ہو، آیئے ہم ہندوستان کے تناظر میں ان چاروں ستونوں کا الگ الگ جائزہ لیں۔

مقننہ یعنی پارلیمنٹ، ہندوستان میں الیکشن کا نظام مستحکم بھی ہے اور صاف شفاف بھی، اتنے بڑے ملک میں صاف ستھرا الیکشن کرانا چیلنج سے بھرپور عمل ہے، ہمارے ملک کا الیکشن کمیشن اس چیلنج کو قبول کرتا ہے اور ہر پانچ سال کے بعد ایک نئی مقننہ لانے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے، لیکن کس طرح کے لوگ الیکشن لڑیں، امیدواروں میں علم و دانش اور عمر کا کیا معیار ہو، انتخابی سیاست میں پیسے کا کتنا رول ہو، یہ سب کچھ طے کرنا الیکشن کمیشن کا کام نہیں بل کہ حکومت یا مقننہ کا کام ہے، اس نے الیکشن کے لیے جو قوانین بنا دئے ہیں، الیکشن کمیشن کو ان ہی کی پابندی کرنی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر الیکشن میں ایک بڑی تعداد ان پڑھ امیدواروں کی ہوتی ہے، ان میں سے اکثر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، امیدواروں کے لیے کوئی مناسب ضابطۂ اخلاق نہ ہونے کی وجہ سے جرائم پیشہ لوگ بھی پارلیمنٹ کے ممبر بن جاتے ہیں، بڑے بڑے بزنس مین، فیکٹریوں اور کارخانوں کے مالکان بھی اپنے پیسے کے بل پر انتخاب جیت لیتے ہیں، اس میں الیکشن کمیشن کا کوئی قصور نہیں، یہ مقننہ کی کمی ہے کہ اس نے دستور سازی کے ذریعے پارلیمنٹ کو جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ بننے سے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

پارلیمنٹ کا کام ملک کے مفادات کا تحفظ ہے، اسے یہ دیکھنا ہے کہ اس کے بنائے ہوئے کن قوانین کے ذریعے ملک ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے، دیکھا جائے تو پہلا

کام پارلیمنٹ کا ہے، باقی اداروں کا کام پارلیمنٹ کے بعد شروع ہوتا ہے، مگر ہمارے ممبران پارلیمنٹ کم ہی کسی ایک بات پر متفق ہوتے ہیں، پارلیمنٹ کا ہر اجلاس مچھلی بازار کا سماں پیش کرتا ہے جہاں حکمراں اور اپوزیشن ایک دوسرے کے ساتھ الجھتے نظر آتے ہیں، بعض اوقات پارلیمنٹ میں ہفتوں کوئی کام نہیں ہوتا، پورا وقت ہنگاموں اور نعرہ بازیوں کی نظر ہو جاتا ہے، حال ہی میں نوٹ بندی کے بعد پارلیمنٹ کا جو اجلاس ہوا وہ مہینہ بھر تو چلا مگر اس دوران کوئی کام نہیں ہوسکا، ملک کا قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا، صدر جمہوریہ ہند نے بھی ممبران پارلیمنٹ کی اس روش پر اپنی تشویش کا اظہار کیا مگر کسی نے بھی صدر جمہوریہ ہند کی تشویش کو سنجیدگی سے لینے کی کوشش نہیں کی، نہ برسر اقتدار پارٹی نے اور نہ اپوزیشن نے۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کتنے بل رک گئے ہوں گے، کتنے اہم معاملات پر فیصلے ملتوی کیے گئے ہوں گے، کتنے عوامی مسائل ہوں گے جن کو حل کرنے کی فوری ضرورت تھی لیکن ان پر غور و خوض بھی نہ ہوسکا ہوگا، چہ جائیکہ کوئی فیصلہ کن موقف اختیار کیا جاتا، فروری میں بجٹ سیشن ہوگا، کیا گارنٹی ہے کہ یہ سیشن کامیاب ہوگا یا اسی طرح بغیر کام کاج کے پارلیمنٹ کی کاروائی ٹھپ رہے گی، پارلیمنٹ کے ہنگاموں سے برسر اقتدار پارٹی فائدہ اٹھا لیتی ہے اور بہت سے ایسے بل ہنگاموں کے دران کامیاب کرالیتی ہے جن پر بحث ہونی چاہیے تھی، جن کو منظور ہونے سے پہلے عوام کے سامنے آنا چاہیے تھا۔

ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ میں حکمراں گروپ اور اپوزیشن کسی ایک بات پر متفق نظر آئیں، پارٹی مفادات سے اوپر اٹھ کر اور سیاست کو کنارے لگا کر پارلیمنٹ میں بحث و مباحثہ کرنا اور عوامی مفادات کو سامنے رکھ کر اتفاق رائے کے ساتھ فیصلے کرنے کی نظیریں بہت کم ہیں، ہاں جب بات ممبران پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور بھتوں میں اضافے کی ہوتی ہے تو پوری پارلیمنٹ ایک زبان ہو کر اس کی تائید کرتی ہے، پارلیمنٹ ایک بااختیار ادارہ ہے اس کے دونوں ایوانوں کو قوم اور ملک کے حق میں صحیح اور بروقت فیصلے لینے کا مکمل اختیار حاصل ہے، افسوس یہ ادارہ اپنے اختیار کا فائدہ نہیں اٹھا پاتا، اس سلسلے

میں حکمراں یا اپوزیشن میں سے کسی ایک کو ذمہ دار قرار دینا صحیح نہ ہوگا بل کہ دونوں ہی اس ذمہ داری سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔

پارلیمنٹ حکومت کا وہ واحد ادارہ ہے جس کا ہر منٹ انتہائی قیمتی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق پارلیمنٹ سیشن کے دوران ہر ایک منٹ پر ڈھائی لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں، ہندوستانی پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے، لوک سبھا اور راجیہ سبھا، ان دونوں ایوانوں میں سال بھر میں تین سیشن ہوتے ہیں، بجٹ سیشن جو فروری سے مئی تک، مانسون سیشن جو جولائی سے ستمبر تک، اور سرمائی سیشن جو نومبر سے دسمبر تک جاری رہتا ہے، یہ تینوں سیشن ہر سال اسی سے سو دن تک چلتے ہیں، اور ہر ہر دن پر لگ بھگ چھ کروڑ روپے صرف ہوتے ہیں، یعنی ہر سال پارلیمنٹ کے تینوں سیشن پر کم و بیش چھ سو کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔

ہماری پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین کی مجموعی تعداد سات سو پچانوے ہے، لوک سبھا کے اراکین کی تعداد پانچ سو پینتالیس اور راجیہ سبھا کے اراکین کی تعداد دو سو پچاس، اراکین پارلیمنٹ کو پچاس ہزار روپے تنخواہ، پینتالیس ہزار روپیہ حلقۂ انتخاب کا الاؤنس، اور آفس کے مصارف کے لیے پینتالیس ہزار روپے ہر ماہ ادا کئے جاتے ہیں، یہ کل رقم ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ہوتی ہے، تمام ممبران کی تنخواہوں وغیرہ کا حساب لگایا جائے تو یہ رقم ایک سال میں ایک ارب تینتیس کروڑ چھپن لاکھ ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ ممبران پارلیمنٹ کو دہلی میں رہائش بھی دی جاتی ہے، ہر رکن پارلیمنٹ کو بجلی کے پچاس ہزار یونٹس فری دئے جاتے ہیں، ان سے ٹیلی فون کا بل، پانی کا بل، گھر کا کرایہ وغیرہ کچھ نہیں لیا جاتا، ہوائی اور ٹرین سفر کی سہولتیں اس کے علاوہ ہیں، ہر رکن کو پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران روزآنہ دو ہزار روپے بہ طور الاؤنس بھی ادا کئے جاتے ہیں۔

قوم کا اتنا بڑا سرمایہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے معزز اراکین پر خرچ ہوتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کام نہ ہو، اور کئی کئی دن بغیر کاروائی کے پارلیمنٹ معطل ہوتی رہے تو اسے قوم کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہیں گے۔

اب آیئے انتظامیہ کی طرف، اسے ہم حکومت یا گورنمنٹ بھی کہہ سکتے ہیں، وزیر اعظم سے لے کر کابینہ کے دوسرے وزراء تک، سکریٹریز سے لے کر تمام چھوٹے بڑے افسران تک انتظامیہ میں شامل ہیں، یہی لوگ ملک کے نظم ونسق کو چلاتے ہیں، پارلیمنٹ کے دئے ہوئے قوانین کو نافذ کرتے ہیں، نفاذ کی نگرانی کرتے ہیں، اور خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی بھی کرتے ہیں، دیکھا جائے تو انتظامیہ کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔

پارلیمنٹ کے اراکین ان میں وزراء بھی شامل ہیں، اصل میں عوامی نمائندے ہوتے ہیں، جنھیں عوام کثرت رائے سے منتخب کرکے بھیجتی ہے، ان میں سے وہ لوگ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں جن کی پارٹی کے اراکین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، یا وہ پارٹی حکومت بنانے کے لیے اپنی حلیف پارٹیوں سے مدد لیتی ہے، انتظامی امور چلانے والے لوگ دوسرے لفظوں میں بیوکریٹ اپنی صلاحیت، بصیرت اور تجربے کی بنیاد پر مقرر یا منتخب کئے جاتے ہیں، ریاست کے نظم ونسق کی ذمہ داری بیوکریٹ پر ہوتی ہیں، یہ لوگ جتنے باصلاحیت ہوں گے، منتظم، دوراندیش اور فعال ہوں گے، ریاست اسی قدر ترقی کرے گی، ارسطو کہتا ہے کہ ریاست کا انتظام ہمیشہ اہل دانش کے سپرد کیا جانا چاہیے، بل کہ اہل دانش کے لیے الگ سے ایک ایسا معاشرہ قائم کردینا چاہیے جہاں رہ کر وہ پرسکون ماحول میں اپنی بصیرت وشعور سے ریاست کا بہتر نظام ترتیب دیں اور اسے چلائیں، لیکن ہمارے ملک میں سب سے زیادہ کرپٹ ہی یہ لوگ ہیں، اوپر سے لے کر نیچے تک، افسر سے لے کر چپراسی تک تمام لوگ سر سے پاؤں تک کرپشن میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی نوکری کے دوران جتنی دولت سمیٹ سکتا ہو سمیٹ لے، حالاں کہ حکومتیں انھیں بھاری بھر کم تنخواہوں کے علاوہ بہترین مراعات سے بھی نوازتی ہیں، اس کے باوجود ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی، نوکر شاہوں کے کرپشن کا اندازہ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کے خزانے سے نکلنے والا

ایک روپیہ اس جگہ پہنچتے پہنچتے جس جگہ کے لیے وہ بھیجا گیا ہے ایک پیسہ رہ جاتا ہے، باقی ننانوے پیسے راستے میں غائب ہو جاتے ہیں، ملک کے موجودہ وزیر اعظم بھی رات دن کرپشن کی دہائی دیتے رہتے ہیں، انھوں نے جون ۲۰۱۶ء میں دوحہ میں کہا کہ انھیں بہت سے لوگوں کو ان کی مٹھائی سے محروم کرکے کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے، حکومت نے سرکاری منصوبوں میں چوری اور لیکیج روک کر سالانہ چھتیس ہزار کروڑ کی بچت کی ہے۔

ابھی حال ہی میں عالمی بنک نے سال گذشتہ کے تجزیہ کی بنیاد پر ایک رپورٹ جاری کی ہے، اس کے اعداد وشمار انتہائی افسوس ناک ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں کرپشن کینسر کی طرح پھیلا ہوا ہے، بہ ظاہر اسے روکنے اور ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، رپورٹ میں بتلایا گیا ہے کہ ہندوستان میں دوسو دس ارب کی رشوت ہر سال لی اور دی جاتی ہے، یہ رقم ملک کی موجودہ گھریلو پیداوار کا چار سو چھتر فی صد ہے، ورلڈ بنک کے مطابق ہندوستانی عوام کو صحت، پولیس، ریونیو اور عدلیہ کی خدمات حاصل کرنے کے لیے سالانہ اکیس کروڑ روپے کی رشوت دینی پڑتی ہے، باسٹھ فی صد لوگ یا تو رشوت دیتے ہیں یا سفارش سے اپنا کام نکالتے ہیں، ہندوستان میں غریبوں کو ایک سو پچاس ارب روپے کی سبسڈی دی جاتی ہے، لیکن اس کا بڑا حصہ بدعنوانوں کی جیب میں چلا جاتا ہے، ورلڈ بنک نے ہمارے ملک کو بدعنوان ممالک کی فہرست میں پندرھواں مقام دیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اعلا عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر بھی انگلیاں اٹھ رہی ہیں اور ان پر بھی کرپشن کے الزامات لگ رہے ہیں، حال ہی میں ہندوستان تحقیقاتی ادارے سی بی آئی نے فضائیہ کے سابق سربراہ ایس پی تیاگی کو چوپر ہیلی کاپٹروں کے معاہدے میں رشوت لینے کے الزام میں ان کے دو ساتھیوں سمیت گرفتار کیا ہے، ذرائع کے مطابق اس سودے میں تین ہزار چھ سو کروڑ کی رشوت لی گئی ہے، کانگریس پارٹی کے نائب صدر راہل گاندھی نے ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی پر رشوت لینے کے جو الزامات لگائے ہیں اس سے پاک صاف انتظامیہ کی ساری امیدیں دم توڑ گئی ہیں، انھوں نے

الزام لگایا ہے کہ وزیر اعظم نے گجرات کے وزیر اعلیٰ رہتے ہوئے سہارا اور برلا گروپ سے کروڑوں کی رقم رشوت میں لی ہے، ان رقوم کا ذکر سہارا اور برلا گروپ کے انکم ٹیکس کھاتوں میں موجود ہے، اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے اس کا فیصلہ ملک کے تحقیقاتی ادارے کریں گے یا عدالتیں اس فریضے کو انجام دیں گی، مگر اس کی نوبت آئے گی یا نہیں، اس سلسلے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

جمہوریت کا تیسرا ستون عدلیہ ہے، انسان فطرتاً قانون شکن واقع ہوا ہے، اسے قانون شکنی سے دور رکھنے یا قانون شکنی کی صورت میں اسے سزا دینے اور قانون کی طرف واپس لانے کے لیے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، اگر عدالتیں نہ ہوں تو کسی مظلوم کو انصاف نہ ملے اور کسی ظالم کو اس کے ظلم سے روکنے والا کوئی نہ ہو، عدالتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے دباؤ سے آزاد رہ کر محض قانون کی روشنی میں کام کریں، ملک میں امن کا قیام اور قانون کی حکمرانی عدالتوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہمارے ملک میں جمہوریت کا یہ ستون بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہے، اسی لیے ملک میں جرائم بڑھ رہے ہیں، اور عدالتوں میں مقدمات کی فائلیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں، مجرم بے خوف ہیں کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ وہ عدالت سے باعزت بری ہو جائیں گے، اگر عدالتیں اپنا کام انصاف کے ساتھ کریں تو ملک سے ہر طرح کے جرائم کا خاتمہ ہو سکتا ہے، عدالتی نظام کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ عام آدمی کے لیے حصول انصاف کی راہ بڑی مشکل پڑتی ہے، اول تو عدالت تک پہنچنے کا عمل آسان نہیں ہے، اس میں اس قدر جھمیلے ہیں کہ بہت سے لوگ تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتے، جو لوگ ہمت کر لیتے ہیں بسا اوقات انہیں پوری زندگی انصاف نہیں مل پاتا، ہمارے ملک میں تیز رفتار انصاف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، نچلی عدالتوں کے فیصلے بالائی عدالتوں میں چیلنج کیے جاتے ہیں اس سے انصاف کا عمل اور طویل ہو جاتا ہے، پھر یہ عمل اتنا گراں قیمت ہے کہ معمولی پونجی رکھنے والا تو اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا، بہت سے لوگ محض اس لیے

کہاں ہو گئے کہ وہ اپنے مقدمات لے کر عدالتوں میں پہنچ گئے تھے۔

ہندوستانی عدالتوں میں زیر التواء مقدمات کی تعداد دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے، ان مقدمات کی تعداد تقریباً تین ملین ہے، ان میں سے چالیس ہزار مقدمات ہائی کورٹ میں زیر التواء ہیں، اور پچاس ہزار سپریم کورٹ میں اور باقی نچلی عدالتوں میں ہیں، یہ اعداد و شمار مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں، چونکہ [illegible] ہیں کہ عدالتوں میں ججوں کی تعداد کم ہے اس لیے مقدمات کا فیصلہ ہونے میں دیر لگتی ہے۔

حکومت کے دوسرے اداروں کی طرح عدالتی نظام پر بھی کرپشن اور بدعنوانی کے الزامات لگتے ہیں، کئی اہم معاملوں میں عدلیہ کے کرپشن کے اسکینڈلس سامنے آ چکے ہیں، ان حالات میں عدالتی نظام کو ہر طرح کے سیاسی دباؤ سے آزاد رکھنے، انصاف کے عمل کو صاف شفاف بنانے اور اسے مظلوموں کے لیے سستا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اگر جمہوریت کا یہ ستون کمزور پڑتا ہے تو مظلوم عوام بالخصوص اقلیتیں اپنی فریاد لے کر کہاں جائیں گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مسلمانوں کا اعتماد مقننہ اور انتظامیہ سے بالکل اٹھ چکا ہے، البتہ عدالتوں کے انصاف پر ان کا بھروسہ ابھی تک باقی ہے، بہت سے واقعات میں عدالتوں نے مسلمانوں کے اعتماد کو استحکام بخشا ہے، خاص طور دہشت گردی کے الزام میں گرفتار بے گناہ اور بے قصور مسلم نوجوانوں کی رہائی کے سلسلے میں عدالتوں نے بعض معاملات میں جس انصاف کا مظاہرہ کیا ہے اس سے مسلمانوں کو بڑی طاقت اور بڑا حوصلہ ملا ہے، عدالتوں کے فیصلوں نے ثابت کر دیا ہے کہ انتظامیہ کس طرح مسلم نوجوانوں کو ہراساں کر رہی ہے، اور کس طرح ان کو من گھڑت مقدمات میں پھنسا کر ان کا اور ان کے خاندان کا مستقبل برباد کر رہی ہے، اگر مقدمات کی تیز رفتار سماعت ہو، اور فیصلوں میں تاخیر نہ ہو تو بہت سے بے قصور ملزم جیل سے باہر نکل سکتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ عدالتیں ان اداروں کو بھی قرار واقعی سزا دیں جو محض شبہ کی بنیاد پر بلا ثبوت بے قصوروں

کو گرفتار کر لیتے ہیں، اور سالہا سال کے لیے ان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے ہیں، بہت سے مقدمات میں بے قصور تو باعزت بری ہو گئے لیکن جن لوگوں نے ان کو اس عذاب میں مبتلا کیا تھا ان کو کوئی سزا نہیں مل سکی، بعض اوقات ان پر مقدمات بھی چلے گو صوبائی حکومتوں کی عدم دلچسپی اور ناکافی شواہد وثبوتوں کی وجہ سے وہ باعزت رہائی پا گئے، اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہوسکتا ہے کہ مظلوموں کو انصاف نہ مل سکے، خواہ وجہ کچھ بھی ہو۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے ملک کی عدالتیں اب اپنے دائرہ کار اور حدود سے باہر نکل کر بھی فیصلے کرنے لگی ہیں بہ طور خاص مسلمانوں کے عائلی معاملات میں بعض محترم جج قرآن وحدیث کی من مانی تشریح کر رہے ہیں، حال ہی میں اتر پردیش ہائی کورٹ اور کیرالہ ہائی کورٹ کے جج صاحبان نے طلاقِ ثلاثہ کو قرآن وحدیث سے متصادم بتلا کر اسے بالکلیہ ختم کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس طرح کی کوششیں نہ صرف یہ کہ غلط ہیں بل کہ شرعی معاملات میں بے جا مداخلت کے مترادف ہیں، عدالتوں کا یہ کام نہیں کہ وہ قرآن وحدیث کے احکام کو زیر بحث لائیں یا ان پر رائے زنی کریں، کیوں کہ وہ ہندوستانی قانون میں مہارت رکھتی ہیں شریعت کی باریکیوں کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

حال ہی میں مکہ مسجد بم دھماکوں کے مجرمین کو سزائے موت سنائی گئی ہے، لیکن اس سے پہلے کے واقعات میں نامزد ملزمین ابھی تک آزاد ہیں، اور ان کے خلاف مقدمات کی رفتار چیونٹی کی رفتار سے بھی ست ہے، ایسے میں یہ سوال خود بہ خود دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ عدالتیں دوہرا پیمانہ کیوں اختیار کر رہی ہیں؟

جمہوریت کا چوتھا ستون میڈیا ہے، موجودہ دور میں میڈیا نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ طاقت ور ہو گیا ہے بلکہ اس کی کارکردگی کا دائرہ بھی انتہائی وسعت اختیار کیا گیا ہے، پہلے صرف پرنٹ میڈیا تھا جس میں اخبارات آتے ہیں اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا آیا، جس میں ٹی وی چینلوں کا شمار ہوتا ہے اور اب میڈیا کی تیسری قسم بھی متعارف ہو چکی ہے جسے سوشل میڈیا کہتے ہیں، اس میں فیس بک، واٹس آپ اور ٹوئٹر وغیرہ شامل ہیں، مصر میں

انقلاب لانے اور ترکی میں بغاوت کچلنے کے لیے سوشل میڈیا کا بھرپور اور کامیاب استعمال کیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں ستر ہزار سے زائد اخبارات ورسائل کی دس کروڑ سے زائد کاپیاں چھپتی ہیں، جنہیں ہر روز کروڑوں لوگ پڑھتے ہیں، اسی طرح اس ملک میں تقریباً سات سو چینل ہیں، جن میں اسی چینل صرف خبریں اور ملکی وبین الاقوامی سیاسی امور پر تجزیے اور انٹرویو نشر کرتے ہیں، بعض چینلوں کا نشریاتی سلسلہ چوبیس گھنٹوں کو محیط رہتا ہے، ہر چینل اپنی TRP بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے، اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے، بعض اوقات نیوز چینل تمام اخلاقی حدود پار کر جاتے ہیں، مگر انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ پاتا، کوئی ان کی گرفت نہیں کرتا، نہ حکومت کچھ کہتی ہے اور نہ عدالتیں ان کی کارکردگی کا نوٹس لیتی ہیں، یہ صحیح ہے کہ اس ملک میں اظہار خیال کی آزادی ہے مگر اس حق کی آڑ میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا کہاں کا انصاف ہے۔

ہمارے ملک کی میڈیا پر بھگوا رنگ چڑھا ہے، میڈیا اپنے اس رنگ کی پردہ پوشی بھی نہیں کرتا، بل کہ ضرورت پڑنے پر اس کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے، پچھلے چند سالوں سے میڈیا مسلم اور اسلام دشمنی میں اس قدر اندھا ہو گیا ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی بھی بم دھماکے کو اسلامی آتنک واد قرار دے دیتا ہے، پھر اس واقعے کی اس قدر تشہیر کرتا ہے کہ پورا ملک وہی زبان بولنے لگتا ہے جو میڈیا انہیں سکھلاتا ہے، خواہ عدالتوں سے وہ لوگ باعزت ہی بری کیوں نہ ہو گئے ہوں جنہیں میڈیا نے مجرم قرار دیا تھا، افسوس تو اس کا ہے کہ میڈیا کو اپنی اس حرکت پر کبھی پشیمانی نہیں ہوتی۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستانی میڈیا مسلمانوں اور ان کے مذہب کے حوالے سے مثبت خبریں شائع نہیں کرتا، طلاق ثلاثہ کو لے کر ہندوستان کے بیشتر نیوز چینلوں نے بحث ومباحثے کے عنوان سے شریعت اسلامیہ پر جس قدر کیچڑ اچھالا ہے میڈیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، افسوس ناک بات یہ ہے کہ میڈیا شرعی مسائل پر بات

چیت کرنے کے لیے عام طور پر ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے جو شریعت کا علم نہیں رکھتے، اور
اگر حسنِ اتفاق سے ان کی محفل میں کوئی باخبر صاحبِ علم آ بھی جاتا ہے تو اینکر حضرات اسے
بولنے نہیں دیتے، اس طرح ٹی وی چینلوں کے مباحثے مذاق بن کر رہ جاتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارا میڈیا مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات کی منظر
کشی سے گریز کرتا ہے، لیکن اگر اسلام اور مسلمان کے حوالے سے کوئی چھوٹی سی چھوٹی منفی
خبر آجائے تو اس کے لیے اپنے پرائم ٹائم تک وقف کر دیتا ہے، اسے میڈیا کی مسلم دشمنی
نہیں تو اور کیا کہیں گے، ملک کے حالات میں فرقہ پرستی کا زہر گھولنے کی جس قدر کوشش
میڈیا نے کی ہے کسی اور نے نہیں کی، دکھ اس بات کا ہے کہ میڈیا اپنی اس کوشش میں پوری
طرح کامیاب ہے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ موجودہ دور میڈیا کا ہے، مگر میڈیا کو بھی یہ حقیقت تسلیم کرلینی
چاہیے کہ معاشرے کے بگڑنے اور سنورنے کی ذمہ داری میڈیا پر ہے وہ چاہے تو
معاشرے کو امن وسلامتی کے راستے پر چلا سکتا ہے اور چاہے تو اسے فتنہ وفساد کی راہ دکھا سکتا
ہے، میڈیا کو اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیے، اسے نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے
چاہئیں۔

جمہوریت نے اظہار رائے کی آزادی کا جو حق دیا ہے اس سے ناجائز فائدہ
اٹھانا میڈیا کو زیب نہیں دیتا، مانا کہ حکومت کسی ٹی وی چینل یا کسی اخبار کی گرفت نہیں
کرتی، یہ بھی تسلیم کہ پولیس بھی بھڑ کے چھتے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتی، عدالتیں بھی میڈیا
کے سامنے خاموش رہنا پسند کرتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ جو چاہے کرے،
جمہوریت کو باقی رکھنے کی ذمہ داری جس طرح پارلیمنٹ کی ہے، بیوکریٹ کی ہے
جیوڈیشری کی ہے اسی طرح میڈیا کی بھی ہے، تمام جمہوری اداروں کو اپنی اپنی
ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیے، جمہوریت کا یہ سفر اسی طرح کامیاب ہوسکتا ہے، ورنہ ملک کو
تباہی سے بچانا بہت مشکل ہے۔

یکساں سول کوڈ اور جمہوریت

یہ ملک مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، صدیوں سے یہاں ہندو اور مسلمان مل جل کر
رہتے آئے ہیں، مسلمانوں نے اس ملک پر ہزار برس تک حکمرانی کی ہے کبھی نہیں سنا گیا
کہ مسلم بادشاہوں نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو ان
کے مذہبی حقوق سے محروم کیا ہو۔

آزادی کے بعد ملک کے رہ نماؤں نے ایک بہترین آئین ملک کے عوام کو دیا،
اس میں تمام لوگوں کے لیے آزادی، انصاف اور مساوات کی ضمانت دی گئی، بالخصوص
اقلیتوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اس ملک میں امن وامان سے رہیں گے، انہیں ہر طرح کا
تحفظ حاصل رہے گا، ان کے ساتھ کسی بھی معاملے میں امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، ان
کو ہر طرح کی مذہبی آزادی ملے گی، حکومت ہند نے برطانوی دور کے شریعت ایکٹ کو
جوں کا توں برقرار رکھ کر مسلمانوں کو باور کرایا کہ انہیں عائلی معاملات میں اپنے پرسنل لا پر
عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، لیکن ہمارے برادران وطن میں ایک طبقہ ایسا بھی
ہے جو قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان اپنے پرسنل لا پر عمل کریں، ان کو مذہبی آزادی حاصل
ہو، آزادی، انصاف اور مساوات جیسے الفاظ کو جو دستور ہند کی روح ہیں ان کے حقیقی معنی
سے محروم کرنا اس طبقے کا دیرینہ خواب ہے، اور اب وہ اس خواب کو تعبیر کا جامہ پہنانے کے
لیے بڑے بے تاب نظر آرہے ہیں۔

جب سے مرکز میں مودی سرکار آئی ہے یہ طبقہ کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آنے لگا ہے،
پہلے انھوں نے تین طلاق کے مسئلے کو اس قدر اچھالا کہ کچھ دنوں تک میڈیا میں اس مسئلے
کے علاوہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، ایسا لگتا تھا کہ ملک کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں، تعلیم

صد فی صد عام ہو چکی ہے، کوئی شہری اب بے روزگار نہیں ہے، سرحدوں پر سکون ہے، اندرون ملک کوئی بے چینی اور اضطراب نہیں ہے، ملک معاشی اور اقتصادی ترقی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، اب اگر کوئی مسئلہ ہے تو تین طلاق کا مسئلہ ہے، اس کی وجہ سے مسلمان عورتیں پس ماندہ نظر آ رہی ہیں، وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں، طلاق کے حوالے سے ان پر ظلم ہو رہا ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ تین طلاق پر پابندی لگادی جائے اور اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو از روئے قانون اسے طلاق ہی تسلیم نہ کیا جائے، یہ وہ سوچ ہے جو ملک کو جمہوریت سے مطلق العنانیت کی طرف لے جا رہی ہے۔

جہاں تک طلاق کا معاملہ ہے، تین طلاق تو ایک بہانہ ہے، اصل میں تو ملک کو یکساں سول کوڈ کی طرف لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے، افسوس اس کا ہے کہ عدالتیں جو آئین کی محافظ ہیں، وہ خود حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دینے لگی ہیں۔

یکساں سول کوڈ کی وکالت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ہمارا ملک ایک سیکولر ڈیموکریسی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ملکی قوانین پر مذہب کا رنگ نہ ہو، بل کہ تمام قوانین بھارتی تہذیب کے تناظر میں وضع کیے گئے ہوں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مذہبی قوانین وقت کے ساتھ ساتھ فرسودہ ہو چکے ہیں اور اب ان میں عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، ان کے خیال میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے، اور ملک کے تمام طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے شخصی اور عائلی قوانین میں یکسانیت ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی اسٹیٹ کے سیکولر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس اسٹیٹ میں مذہب کی کوئی حیثیت نہ ہو اور اس کے ہر شہری کو مذہب سے لاتعلق، نا آشنا اور بیگانہ بنا دیا جائے بل کہ کسی اسٹیٹ یا ریاست کے سیکولر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اس کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہوں گے، ان کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی، مذہب فرد کا ذاتی اور نجی معاملہ

ہوگا، حکومت کسی مذہبی معاملے میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرے گی جب تک وہ امن عامہ کے لیے خطرہ ثابت نہ ہو۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی تعلیمات کسی ایک زمانے یا کسی ایک نسل انسانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بل کہ ان کا دائرہ قیامت تک آنے والی نسلوں تک وسیع ہے، اس لیے ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اسلام کے شرعی قوانین کی افادیت ختم ہو چکی ہے، اور اب وہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں، اسلام چودہ سو سال پرانا مذہب ہے اور اس کے قوانین بھی چودہ سو سال پرانے ہیں، ان صدیوں میں کہیں اور کبھی ان تعلیمات کی افادیت اور معنویت کو چیلنج نہیں کیا گیا اور نہ اب اس کی ضرورت ہے، ان شاء اللہ یہ قوانین صدیوں تک اسی طرح باقی رہیں گے اور مسلمان ان پر عمل کرتے رہیں گے، جہاں تک نئے تقاضوں اور نئے حالات کا معاملہ ہے شریعت اسلامیہ میں ان کے لیے بھی اصولی رہ نمائی موجود ہے، اور علماء وفقہاء شرعی اصولوں کی روشنی میں ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی رہ نمائی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی یہ اصولی رہ نمائی اسی طرح جاری رہے گی۔

قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی رواداری کا تعلق دلوں سے ہے، اگر سب کے لیے ایک جیسے قوانین بنا بھی دیے جائیں اور دلوں میں کوئی گنجائش نہ ہو تب بھی ملک کے اندر باہمی رواداری کا ماحول پیدا ہونا مشکل ہے، اس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ خود ہندو مذہب کو ماننے والے مختلف گروہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں، یہاں تک کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اپنے کنوؤں سے پانی نہیں لینے دیتا، انہیں اپنے مندروں میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے راستوں اور گلیوں میں چلنے نہیں دیتا، جب ایک مذہب کے ماننے والے طبقات میں باہمی آویزش کا یہ حال ہے تو مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں یہ ہم آہنگی کیسے پیدا ہوگی، ملک کے دانش وروں کو اس سوال پر غور کرنا چاہیے بلاشبہ قومی یک جہتی اس ملک کی پہلی ضرورت ہے لیکن اسے مذہب کی لاش پر فروغ نہیں دیا جا سکتا، بل کہ دلوں کی دوریاں ختم کر کے ملک کے تمام طبقات کو محبت اور یگانگت

کی ایک لڑی میں پرویا جاسکتا ہے۔

یکساں سول کوڈ کی بات آتی ہے تو دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے، اس دفعہ کا تعلق رہنما اصولوں سے ہے، اس میں کہا گیا ہے ''ریاست کی کوشش ہوگی کہ پورے ملک میں تمام شہریوں کے لیے یکساں قانون نافذ ہو''۔

جن لوگوں نے یہ اصول وضع کیے ہیں اور یہ قانون بنا کر منظور کیا ہے وہ اس وقت کے دانش ور طبقے سے تعلق رکھتے تھے، سماجی اور قانونی امور کے ماہر تھے، ملکی حالات سے پوری طرح باخبر اور قوم کے نبض شناس تھے، وہ چاہتے تو دستور میں دفعہ ۴۴ کا اضافہ کرنے کے بجائے یکساں سول کوڈ کی دفعات بڑھا دیتے، لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ ملک اتنی مختلف النوع تہذیبوں کا گہوارہ ہے کہ ان کو کسی ایک شخصی قانون کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے بہت سے مسلم ممبران اسمبلی نے اس دفعہ پر اعتراض بھی کیا اور اس کو ختم کرنے یا اس سے مسلمانوں کو مستثنی کرنے کا مطالبہ بھی رکھا، لیکن انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شخصی قوانین ختم کر دئے جائیں گے خواہ مسلمان عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے، کسی کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیے کہ صرف اختیار مل جانے کی وجہ سے حکومت اس پر عمل کے لیے اصرار کرے گی، حکومت کے اختیارات عملاً ہمیشہ محدود ہوتے ہیں، خواہ لفظی طور پر آپ انہیں کتنا ہی لامحدود کر دیں''(۱)۔

دفعہ ۴۴ کا تعلق رہنما اصولوں سے ہے، جن کے متعلق دستور ہند کے آرٹیکل ۳۷ کے ذریعے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اس نوعیت کے جتنے اصول موجود ہیں ان کو عدالتوں کے ذریعے نافذ نہیں کیا جاسکتا، ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ یہ اصول ملک کے مستقبل کا خاکہ پیش کرنے کی ایک کوشش ہے، اس طرح کے اور بھی اصول موجود ہیں جن پر ابھی تک عمل نہیں ہوسکا، کیوں کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، مثال کے طور پر آرٹیکل ۳۸ میں کہا گیا ہے کہ ''افراد کے مابین، مختلف علاقوں میں رہنے والوں اور مختلف

(۱) ڈاکٹر امبیڈکر کی تقریر۔

پیشوں میں کام کرنے والوں کے مراتب، سہولتوں اور مواقع کے درمیان برابری پیدا کی جائے گی''۔ کیا یہ برابری ہوگئی؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہوگا، کیوں کہ ایسی برابری پیدا کرنا ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام افراد کو یکساں مرتبہ حاصل ہو، یکساں سہولتیں ملیں اور ایک جیسے مواقع میسر ہوں، اسی طرح آرٹیکل ۳۹ میں کہا گیا ہے کہ ''ملکی نظام قانون کو اس طرح فروغ دیا جائے کہ ہر شہری کو حصول انصاف کے یکساں مواقع حاصل ہوں'' دل پر ہاتھ رکھ کر بتلایئے کیا عملاً ایسا ممکن ہے، لاکھوں کروڑوں افراد آج بھی سرمائے کی کمی یا کسی اور وجہ سے انصاف کے مندروں یعنی عدالتوں میں قدم نہیں رکھ پاتے۔

ویسے بھی دفعہ ۴۴ جس میں یکساں شہری قانون کا وعدہ کیا گیا، دستور ہند میں دئے گئے بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ سے متصادم ہے، جس میں مذہبی آزادی کا وعدہ کیا گیا ہے، یعنی ملک کے ہر شہری کو یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اسے مذہب قبول کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کو پھیلانے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔

ویسے بھی یہ ملک اس قدر وسیع ہے اور اتنی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے لبریز ہے کہ کسی ایک قانون پر ان کو جمع کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اگر کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس ملک کے تمام طبقے جن کا رہن سہن الگ، کھانا پینا الگ، وضع قطع اور لباس الگ، بول چال الگ، رسم و رواج الگ کسی ایک تہذیب پر متفق ہوسکتے ہیں ایسے لوگوں کی صحت دماغ پر شبہ ہونے لگتا ہے، ان کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے ہیں، ایسے خواب تشنۂ تعبیر ہی رہتے ہیں، حقیقت کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

حکومت کتنا ہی شور مچائے، عدالتیں کتنے بھی مشورے دیں، اور ٹی وی چینل کتنا بھی چیخیں چلائیں مجھے نہیں لگتا کہ اس ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ ہوسکتا ہے، یہ صرف انتخابی حربے ہیں، اور نشانہ صرف مسلمان ہیں، مقصد ان کو اذیت میں مبتلا کرنا ہے، اور ہندو ووٹ بنک کو متحد کرنا ہے، اگر اس ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش بھی کی

گئی تو ہندو بھی شاید اسے قبول نہ کریں، شاید میں نے لفظ شاید غلط استعمال کیا ہے، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کریں گے، کیوں کہ ہندو مذہب خود مختلف گروہوں اور طبقوں پر مشتمل ہے، اور ہر گروہ کے نظریات وعقائد دوسرے گروہ سے مختلف ہیں، چناں چہ کوئی مورتی کو پوجتا ہے، کوئی نہیں پوجتا، کوئی رام کو مانتا ہے کوئی راون کو مانتا ہے، جنوبی ہند کے ہندوؤں میں بھانجی سے نکاح کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا، جب کہ شمالی ہند کے ہندو اسے برا سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض قبائلی ہندوؤں میں ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھ سکتا ہے جب کہ عام ہندوؤں کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں ہے، جس میں ملک کے صرف ایک مذہب کے ماننے والوں میں رسم ورواج اور عقیدہ ونظریئے میں اس قدر فرق اور اتنا تنوع پایا جاتا ہو وہاں یکساں سول کوڈ کی بات کرنا کم عقلی اور نادانی کی بات ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے وہ اپنے دینی معاملات میں نہایت مضبوط اور متصلب ہیں، اگر آپ شادی بیاہ اور نکاح وطلاق ووراثت وغیرہ کے قوانین ان کے دین وشریعت سے ہٹ کر بناتے ہیں اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مسلمان اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے، صدیوں سے یہ ملک کسی ٹکراؤ اور تصادم کے بغیر مختلف مذاہب کے درمیان آگے بڑھ رہا ہے، اسے اسی طرح آگے بڑھنا چاہیے، جو لوگ اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ محب وطن نہیں ہیں بلکہ کے ملک کے دشمن ہیں۔

جمہوریت کا سفر

آج ہم ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں، ہمیں نہ صرف آزادی کی دولت میسر ہے بل کہ جمہوریت کی نعمت بھی ملی ہوئی ہے، ہمیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو معلوم بھی نہیں کہ ہمارے بزرگوں نے آزادی سے جمہوریت تک کے سفر میں کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں کتنے دکھ جھیلے ہیں اور کتنی قربانیاں دی ہیں، اس ملک کا کوئی گوشہ کوئی چپہ ایسا نہیں ہے جو ہمارے بزرگوں کے خون سے لالہ زار نہ ہوا ہو۔

ہم ہر سال آزادی اور جمہوریت کے دو دن جوش ومسرت کے ساتھ مناتے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ مسرت اور خوشی کے ان لمحات میں ہم اپنے بڑوں کی قربانیوں کو یاد نہیں رکھتے اور نہ یاد رکھنا چاہتے ہیں، حکومتوں پر بے حسی کا عالم طاری ہے، کچھ لوگ تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں، کسی صدر یا وزیر اعظم کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ جنگ پلاسی کا ذکر کرے، سید احمد شہیدؒ کی قربانیوں کو یاد کرے، سلطان ٹیپو شہیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرے، شاملی کے میدان میں خون بہانے والوں کا ذکر خیر کرے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شہید ہونے والوں کی یاد میں دو چار آنسو بہا لے، ان کے ساتھ ساتھ ہم مسلمان بھی انہیں یاد نہیں کرنا چاہتے، اگر یاد کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہتا تو آج مجاہدین آزادی کے کارناموں کا تذکرہ بچے بچے کی زبان پر ہوتا، افسوس ہم داستان پارینہ کی طرح انہیں بھلا چکے ہیں، دل چاہتا ہے کہ ان صفحات پر کچھ ذکر اس جدوجہد کا ہو جائے جو ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جاری رہی، بالآخر مادر وطن کے افق پر آزادی کا سورج روشن ہوا، اور آزادی کے پہلو سے جمہوریت کی صبح نے جنم لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی:

شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہم تقریباً دوسو سال تک انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں قید رہے ہیں، یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۲۴/ستمبر ۱۵۹۹ء کو اس ملک کے ساحلوں پر قدم رکھا، برطانیہ کے سوتاجروں نے تیس ہزار پونڈ کے سرمایے سے غیر ملکوں میں تجارتی مقاصد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی تھی، شروع میں اس کمپنی نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنگال کو بنایا، یہیں سے اس ملک میں انگریزوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، مغل بادشاہوں کے دربار میں پہنچے، ان کی خوشنودی حاصل کی، اور پورے ملک میں بے روک ٹوک دندناتے پھرنے لگے، اورنگ زیب عالم گیرؒ کے عہد حکومت تک وہ اپنے خفیہ مقاصد میں کامیابی نہ حاصل کر سکے کیوں کہ ان کی حکومت مضبوط بنیادوں پر استوار تھی، اور وہ ایک معاملہ فہم اور جہاں دیدہ بادشاہ تھے، ان کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء میں جب مغلوں کی حکومت کمزور ہونے لگی اور پورے ملک میں افراتفری کا دور دورہ شروع ہوا تب انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت یہاں منتقل کرنی شروع کردی، مغل بادشاہوں نے ان کو نوازنے اور ان پر اپنے الطاف واحسانات کی بارش کرنے میں پوری دریادلی سے کام لیا، لیکن دولت کے ان لالچیوں نے احسان کا بدلہ احسان فراموشی سے دیا، دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی ایک منظم اور طاقت ور فوج میں تبدیل ہوگئی، اس کا پہلا نشانہ بنگال کے عوام بنے، جہاں نواب سراج الدولہ کی حکومت تھی۔

پلاسی کی جنگ:

پلاسی ایک گاؤں کا نام ہے جو اس وقت کے متحدہ بنگال کے دارالحکومت مرشدآباد سے تیس میل دور اور مغربی بنگال کے موجودہ دارالحکومت سے ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر ایک دریا کے کنارے واقع تھا، اس وقت بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نواب بیس سالہ سراج الدولہ وہاں کے حاکم تھے، کیوں کہ بنگال کی سرزمین زرخیز تھی، اور وہاں کی ہنرمندی کا دنیا بھر میں شہرہ تھا، اس لیے انگریز چاہتے تھے کہ دہلی کی طرح بنگال میں بھی

ان کی کٹھ پتلی حکومت ہو، نواب سراج الدولہ کو یہ منظور نہیں تھا، انگریزی جنرل کلائیو اپنی تین ہزار فوج لے کر جس میں پچیس سو ہندوستانی تھے پلاسی کے میدان میں پہنچ گیا، نواب سراج الدولہ اپنی پچاس ہزار فوج کے ساتھ مرشدآباد سے پلاسی کی طرف بڑھا، اس فوج میں پینتیس ہزار پیادہ اور پندرہ ہزار گھڑسوار فوجی تھے، لیکن نواب سراج الدولہ یہ جنگ ہار گیا، کیوں کہ نواب کی فوج کے ایک کمانڈر میر جعفر نے فوج سے غداری کی اور اپنی ڈویژن کے ساتھ انگریزوں سے جاملا، ادھر آسمان سے برسنے والی تیز بارش نے نواب کی توپوں کو ناکارہ کردیا، پورے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی، اس طرح شکست نواب سراج الدولہ کی مقدر بن گئی، جنگ پلاسی کے بعد نواب سراج الدولہ کی انتہائی مسخ شدہ لاش مرشدآباد میں نمائش کے لیے لائی گئی، اور ۶/ دن بعد میر جعفر بنگال، بہار اوراڑیسہ کا نواب بن بیٹھا، اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں اس کی غداری کی وجہ سے ایک سیاہ باب کا آغاز ہوگیا، سراج الدولہ انگریزوں کو ہندوستان میں آگے بڑھنے سے تو نہ روک سکا، لیکن وہ اپنے پیچھے جرأت، عزم، حوصلے اور بہادری کی ایک ایسی داستان چھوڑ گیا جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ:

بنگال کی فتح کے بعد انگریز ملک کے دوسرے خطوں کی طرف بڑھنے لگے، کمپنی کی حکومت کا دائرہ وسیع ہوگیا، اکثر امراء اور نواب اپنی آپسی رقابت اور چپقلش کی وجہ سے انگریزوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام نظر آئے، بالآخر ایک ایک کر کے سب ایسٹ انڈیا کمپنی سے مصالحت کرنے اور اس کو حکمرانی کے حقوق دے کر برائے نام حکمراں بنے رہنے پر مجبور ہوگئے، صرف ایک نام سلطان ٹیپو کا ایسا ہے جس نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور برطانوی سامراج کے خلاف بھرپور جدوجہد کی اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرنے کے لیے سنجیدہ عملی اقدامات کیے، انہوں نے ترکی، ایران، افغانستان اور فرانس سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر اس سلسلے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں

ملی، بنگال کی طرح سلطنت میسور میں بھی وہی صورت حال پیش آئی، حیدرآباد دکن اور مرہٹوں نے ٹیپو سلطان کی فوجی قوت کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اور انگریزوں سے ہاتھ ملا لیا، مگر سلطان نے ہار نہیں مانی اور اپنی فوج کے ساتھ بدستور ڈٹے رہے، تاریخ میں آب زر سے لکھا جانے والا ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہے، ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے''۔

سلطان ٹیپو کے والد حیدر علی بھی انگریزوں کے سخت دشمن تھے، جنوبی ہند کا یہ واحد بادشاہ ہے جس نے پچاس سال تک انگریزوں کو اپنی حدود سلطنت میں داخل ہونے سے روکے رکھا، انھوں نے انگریزوں سے دو جنگیں بھی لڑیں، ابھی میسور کی دوسری جنگ جاری تھی کہ سلطان حیدر علی وفات پا گئے، ان کے بیٹے فتح علی ٹیپو سلطان جانشین قرار پائے، انگریز دشمنی ان کی سرشت میں داخل تھی، باپ کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں سے جنگ جاری رکھی، یہاں تک کہ وہ ۱۷۸۴ء میں سلطان سے مصالحت کرنے پر مجبور ہو گئے، اس زمانے میں ریاست میسور ہندوستان کی سب سے زیادہ خوش حال ریاست تھی، ایک انگریز مؤرخ نے ریاست کی خوش حالی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے ''میسور ہندوستان میں سب سے سرسبز علاقہ ہے، یہاں ٹیپو کی حکمرانی ہے، میسور کے باشندے ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال ہیں، اس کے برعکس انگریزی مقبوضات صفحۂ عالم پر بدنما دھبوں کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں رعایا قانونی شکنجوں میں جکڑی ہوئی پریشان حال ہے''۔

سلطنت میسور کی یہ خوش حالی انگریزوں کے دلوں کو نشتر بن کر زخمی کرتی تھیں، دوسری طرف پڑوسی ریاست حیدرآباد دکن کے حکمراں بھی ٹیپو سلطان سے خوش نہ تھے، مرہٹے بھی موقع کے منتظر تھے، چناں چہ ان دونوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کر دیا، یہ تیسری جنگ تھی جو میسور نے انگریزوں کے ساتھ لڑی، اس متحدہ قوت کا مقابلہ کرنا اکیلے ٹیپو سلطان کے بس میں نہیں تھا، دو سال مسلسل برسرپیکار رہنے کے بعد سلطان کو انگریزوں سے مصالحت کرنے اور اپنی نصف ریاست سے دست بردار ہونے پر مجبور

ہونا پڑا، یہ بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا، مگر سلطان ٹیپو نے ہار نہیں مانی بلکہ وہ برابر انگریزوں کو اپنی سلطنت کے مقبوضہ حصے سے بے دخل کرنے کی تدبیریں کرتے رہے، ان کی یہ جدوجہد میسور کی چوتھی جنگ پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ یہ ۱۷۹۹ء کا واقعہ ہے، اس جنگ میں میر صادق، غلام علی اور دوسرے فوجی جرنیلوں اور حکومت کے اعلا عہدہ داروں کی غداری کی وجہ سے سلطان کو شکست ہوئی، اور وہ دارالحکومت سرنگاپٹنم کے قلعے کے صدر دروازے کے باہر بہادری اور جواں مردی کے ساتھ لڑتے ہوئے ۱/مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گئے، انگریز کمانڈر لارڈ ہارس نے سلطان ٹیپو کی لاش دیکھ کر انتہائی فخر وغرور کے ساتھ کہا ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے''۔

دہلی کی حکومت پر قبضہ:

مغلوں نے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک لگ بھگ سوا تین سو سال ہندوستان پر حکومت کی، اس عہد حکومت کی بنیاد ظہیر الدین بابر نے رکھی، ۱۷۰۰ء میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے قبل مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی جس کا رقبہ چالیس لاکھ مربع کلو میٹر تھا، اورنگ زیب کے بعد اس سلطنت کا زوال شروع ہو گیا، جس کی وجہ شہزادوں کی آپسی رنجش اور چپقلش تھی، سلطنت میسور کو فتح کرنے کے بعد انگریز فوجیں دہلی کی طرف بڑھیں جہاں مغلیہ سلطنت کا آخری چراغ جھلملا رہا تھا، مغلیہ اقتدار کی محافظ مرہٹہ فوجیں انگریزوں کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور ۱۸۰۳ء میں انگریز دہلی میں فاتحانہ شان سے داخل ہو گئے، اس وقت دہلی میں شاہ عالم تخت حکومت پر متمکن تھے، انگریزوں نے ان سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے جس میں یہ الفاظ تحریر تھے، ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' اس زمانے میں یہ جملہ زبان زد عام وخاص تھا ''حکومت شاہ عالم از لال قلعہ تا پالم'' اور حقیقت بھی یہ ہی تھی، سلطنت مغلیہ لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، پوری دلی کیا تمام ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا حکم اور ان کا سکہ چلنے لگا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ جہاد:

یہ انیسویں صدی کے ابتدائی ماہ وسال کی بات ہے، مغل حکومت کا سورج پوری طرح غروب ہو چکا تھا، اب صرف انگریزوں کی حکومت تھی، ان حالات میں ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اس جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھائے، اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کرے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے آباؤاجداد اور خود انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمیشہ علمی اور عملی رہ نمائی کی، یہ عظیم کارنامہ بھی اسی خاندان کی قسمت میں تھا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بڑے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کی طاغوتی حکومت اور غیر ملکی استعماریت کے خلاف ایک فتوی جاری کیا جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا، یہ فتوی ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا محرک اور سبب قرار پایا۔

کچھ ہی دنوں میں اس فتوے کے اثرات مرتب ہونے لگے، جو مسلمان علماء سقوط دہلی کے بعد گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے وہ باہر نکلنے پر آمادہ نظر آئے، حضرت شاہ صاحبؒ نے صرف فتوی دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا عملی آغاز بھی کر دیا، ۱۸۰۸ء میں مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر نے ٹونک کے والی نواب امیر خاں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف ایک محاذ بنایا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک عزیز شاگرد حضرت سید احمد بریلویؒ کو اس محاذ میں شامل ہونے کے لیے بھیجا، حضرت بریلویؒ سات سال تک اس فوج سے وابستہ رہ کر انگریزوں سے جنگ کرتے رہے، جب انھوں نے دیکھا کہ اب یہ محاذ بھی انگریزوں سے مصالحت پر آمادہ ہے تب آپ دہلی واپس آ گئے۔

سیدینؒ کی تحریک:

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے طے کیا کہ ایک ایسی جماعت تشکیل دی جائے جو ملک کے طول وعرض میں دورے کرے اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان میں جہاد کا جذبہ بھی پیدا کرے، اس جماعت میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا

عبدالحیؒ جیسے اہل علم جو حضرت شاہ صاحب کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شامل ہوئے اور حضرت سید احمد بریلویؒ ان کے سالار کارواں قرار پائے، اس قافلے میں تقریباً پچاس افراد شامل تھے، ان حضرات نے ۱۸۱۸ء میں اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز غازی آباد، مرادنگر، میرٹھ، بڈھانہ، کاندھلہ، پھلت، مظفرنگر، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون، سہارن پور، روہیل کھنڈ، بریلی، لکھنؤ اور الہ آباد وغیرہ کے دوروں سے کیا، یہ قافلہ جہاں سے بھی گزرا اور جس جگہ بھی ٹھہرا وہاں اپنے اثرات چھوڑتا چلا گیا، ہزاروں لوگ شرک وبدعت سے تائب ہو کر دین کے صحیح راستے پر چلنے لگے، آپ اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب بھی دیتے تھے، یہ سفر تقریباً دو سال تک جاری رہا، اختتام پر آپ دہلی تشریف لائے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں اپنے اسفار کے احوال سنائے۔

دوسرا سفر ۱۸۲۱ء میں شروع ہوا، ارادہ حج کا تھا، بہت سے شہروں میں قیام کرتے ہوئے آپ کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں دو ماہ مقیم رہے، اس دوران لگ بھگ ساٹھ ہزار افراد اپنی پچھلی زندگی سے تائب ہو کر آپ کے دامن رشد وہدایت سے وابستہ ہوئے، دو سال کے بعد سفر حج سے واپسی ہوئی، اس دوران حضرت شاہ عبدالعزیزؒ وفات فرما چکے تھے، واپسی کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ نے جہاد کی تیاری شروع کی، اس تیاری میں تقریباً دو سال لگے، آپ نے جہاد کے لیے اپنا مرکز صوبۂ سرحد کو بنایا، جہاں صرف مسلمان آباد تھے، محل وقوع کے اعتبار سے یہ علاقہ افغانستان، ایران اور دوسری مسلم حکومتوں سے قریب تھا، جہاد کے دوران ان سے مدد لی جا سکتی تھی، ان دنوں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو انگریزوں کے حلیف تھے، سکھ اپنے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر اپنی مسلم رعایا پر ظلم وستم ڈھانے میں مصروف تھے، شاہ صاحب سب سے پہلے اس حکومت سے نمٹنا چاہتے تھے، اس کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ کسی ایسے علاقے کو مرکز بنایا جائے جہاں صرف مسلمان رہتے ہوں، اور ان کے دلوں میں غیرت دینی اور جذبۂ جہاد بھی پورے پورے طور پر موجود ہو، اس مقصد کے لیے سرحد سے بہتر کوئی علاقہ نہ تھا۔

جنوری ۱۸۲۲ء میں آپ کا یہ سفر شروع ہوا، آپ ان دنوں رائے بریلی میں مقیم تھے جو آپ کا آبائی وطن بھی ہے، رائے بریلی سے چل کر آپ گوالیار ٹونک، اجمیر، حیدرآباد سندھ، شکارپار، کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور پشاور ہوتے ہوئے چارسدہ پہنچے، اور اسی جگہ قیام فرمایا، اس سفر میں تقریباً دس ماہ لگے، ابتدا میں ان کے رفقاء کی تعداد پانچ سو تھی، چارسدہ پہنچتے پہنچتے یہ تعداد بڑھ کر ڈیڑھ ہزار ہوگئی، اس کے بعد پورے ملک سے مجاہدین کے قافلے وہاں پہنچنے لگے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے جس وقت تحریک جہاد شروع کی اس وقت ہندوستان کے بڑے حصے پر انگریزوں کی حکومت تھی، صرف چند علاقے ایسے تھے جہاں ان کا اقتدار تو نہیں تھا لیکن جو لوگ اقتدار پر قابض تھے وہ انگریزوں کے حلیف اور ان کے ہمدرد سمجھے جاتے تھے، صوبۂ پنجاب بھی ایسے ہی علاقوں میں سے ایک تھا، سید صاحب نے سب سے پہلے اسی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کا ارادہ کیا، اس کے دو سبب بیان کیے جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ حکومت پنجاب اپنی مسلم رعایا پر ظلم کر رہی تھی، اور ان کے دینی شعائر کو مٹانے اور ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ سکھوں کی حکومت مسلمان علاقوں اور انگریز کے مقبوضہ علاقوں کے درمیان بڑی رکاوٹ تھی، ضروری تھا کہ پہلے اس رکاوٹ کو دور کیا جائے پھر انگریزوں کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کا سکھوں سے پہلا مقابلہ ۲۱/ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا، جس میں سینتیس مجاہدین شہید اور سینتیس زخمی ہوئے، اس میں مسلمانوں کو کامیابی ملی، سکھوں نے پسپائی اختیار کی، پورے علاقے میں سید صاحبؒ اور ان کی جماعت کی دھاک بیٹھ گئی، آس پاس کے امراء و حکام سید صاحبؒ کے ارد گرد جمع ہونے لگے، اس جنگ سے فارغ ہو کر اس علاقے میں سید صاحب نے اسلامی حکومت قائم کی، اور قصبات و دیہات میں اپنے عمال متعین کر دیے، ہر جگہ عشر و زکوۃ کی وصولی کا نظام قائم کیا، اسلامی عدالتوں کی داغ بیل ڈالی اور غیر شرعی رسوم و بدعات کا خاتمہ کر ڈالا۔

یہاں بھی وہی ہوا جو جنگ پلاسی میں ہوا تھا اور جو جنگ میسور میں ہوا تھا، یعنی غداروں کا ظہور، یہ وہ لوگ تھے جو سید صاحب کی اسلام پسندی سے بیزار تھے، قبائلی امراء کا خیال تھا کہ سید صاحب نفاذ شریعت کی آڑ میں حکومت کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عارضی حکومت کے قیام کے کچھ دنوں بعد جب سکھوں سے دوبارہ جنگ ہوئی تو پشاور کے حکمراں یار محمد خاں نے سید صاحبؒ کے کھانے میں زہر ملا دیا، جس سے سید احمد شہیدؒ کی حالت دگرگوں ہوگئی، مگر وہ اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں پہنچ گئے، اس موقع پر ایک لاکھ مجاہدین موجود تھے، قریب تھا کہ سکھوں کے ظلم کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا کہ پشاور کے سردار اپنی فوج اور اسلحہ لے کر میدان کارزار سے فرار ہو گئے، باقی ماندہ مجاہدین کسی طرح اپنی جان بچا کر ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہوئے، ایک ہفتے کے بعد سید صاحبؒ کو صحت تو نصیب ہوگئی مگر شکست نے ان کو نڈھال کر دیا۔

تحریک سیدینؒ کی ناکامی:

حضرت سید احمد شہیدؒ اس شکست سے بددل ہو کر چارسدہ چھوڑ کر پنجتار چلے گئے، یہ علاقہ نسبتاً محفوظ تھا مگر قبائلی سرحد والوں کی ریشہ دوانیاں یہاں بھی جاری رہیں، یہاں تک کہ کچھ قبائل مجاہدین سے لڑنے کے لیے بھی صف آرا ہو گئے، پہلے ہنڈ کے سردار خان ولی خاں سے مقابلہ ہوا، مجاہدین کو فتح نصیب ہوئی، پھر پشاور کے سردار یار محمد خاں سے جنگ ہوئی، اس جنگ کے نتیجے میں پشاور بھی فتح ہو گیا، اس فتح سے دوسرے سرداروں کے نیند حرام ہو گئی، انہیں خیال ہوا کہ اب باقی علاقے بھی آہستہ آہستہ مجاہدین کے قبضے میں چلے جائیں گے، جنگ کی ہمت تو ان میں تھی نہیں، البتہ انھوں نے سید صاحبؒ اور ان کی تحریک کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

شکست خوردہ سرداروں نے دوسرے سرداروں سے مل کر سید صاحبؒ کی تحریک کو وہابی تحریک کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عوام میں اشتعال پھیل گیا، کل تک جو

لوگ سرسید صاحبؒ کو اپنا رہبر وقائد سب کچھ مانتے تھے وہ ان کے، ان کی تحریک کے اور ان کے عمال کے مخالف ہوگئے، یہاں تک کہ انھوں نے بہت سے مجاہدین اور عمال کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل بھی کردیا، اس واقعے کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے باقی ماندہ رفقاء کے ساتھ سندھ چلے گئے۔

مجاہدین کی روانگی کے بعد پشاور پر سکھوں نے قبضہ کرلیا، راجہ رنجیت کی فوج چاہتی تھی کہ سید صاحب کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے، اور ان کو ختم کردیا جائے تاکہ وہ آئندہ ان کی مزاحمت نہ کریں، سکھ راجہ رنجیت سنگھ نے سید صاحب کے خلاف اندرونی اور بیرونی تمام محاذ ایک ساتھ کھول دئے، بالآخر ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سید صاحب اور سکھوں کے درمیان زبردست مقابلہ ہوا، مہاراجہ کا بیٹا شیر سنگھ اپنی بیس ہزار فوج کے ساتھ مقامی غداروں کی مدد سے بالاکوٹ کے پہاڑی علاقوں میں راتوں رات داخل ہوگیا اور مجاہدین کی جماعت پر اچانک حملہ کردیا، سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے مردانہ وار مقابلہ کیا، لیکن اس معرکے میں حملہ آور سکھ غالب رہے، سید احمد اور شاہ اسماعیلؒ اور بعض دوسرے اکابرین نے جام شہادت نوش کیا، اس طرح یہ تحریک بھی ناکام ہوگئی۔

اس جنگ کے بعد بچے کھچے مجاہدین پہاڑوں پر چلے گئے، اور وہاں سے انہوں نے اپنی جدوجہد کا پھر آغاز کیا، ان مجاہدین کی قیادت سید صاحبؒ کے ایک ممتاز عقیدت مند مولانا محمد قاسم پانی پتی کررہے تھے، ان لوگوں کو دہلی اور دوسرے علاقوں سے مالی امداد ملتی رہی، انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد کا یہ سلسلہ مختلف جگہوں پر ۱۸۵۷ء تک چلتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں ایک بڑا جہاد ہوا جس کو انگریز بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں، حالاں کہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک منظم جہاد تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی:

مئی ۱۸۵۷ء کے آس پاس مسلح جنگ آزادی کا بگل بجا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس سے پہلے یوپی کے میرٹھ اور بنگال کے بارک پور

میں انگریزوں کے خلاف عوام کے غصے اور نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا، حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ آزادی کا سلسلہ کبھی رُکا ہی نہیں تھا، بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک ناکام ہوگئی تھی، لیکن جو مجاہدین اس جنگ میں بچ گئے تھے انھوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے کیمپ قائم کرلئے اور وہ انگریزوں کے ساتھ گوریلا جنگ لڑنے لگے، ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے ملک میں اپنے پاؤں جمالئے تھے، تمام ریاستیں اس کے سامنے سرنگوں ہوگئیں تھی، محبین وطن کی آنکھوں میں یہ صورت حال خار کی طرح کھٹک رہی تھی، دوسری طرف فوجی چھاؤنیوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ فوجیوں کو جو کارتوس فراہم کئے جاتے ہیں ان میں سور اور گائے کی چربی ملائی جاتی ہے، یہ بھی مشہور ہوا کہ گھی میں ناپاک چربی ملائی جارہی ہے، کنوؤں میں گائے اور سور کے ناپاک اجزاء ڈالے جارہے ہیں تاکہ ان کا پانی ناپاک ہوجائے، آٹے میں سور اور گائے کی ہڈیوں کا برادہ ملایا جارہا ہے، اس طرح کی افواہوں نے انگریزی فوج میں شامل ہندوستانیوں کے غصے کو ساتویں آسمان پر پہنچادیا، ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔

میرٹھ میں متعین سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے منع کردیا، کیوں کہ انہیں بندوقوں میں ڈالنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا، ایسے تمام سپاہیوں کی وردی اتروالی گئی، انہیں گرفتار کرکے ہتھکڑی پہنادی گئی اور انہیں ملازمت سے برخواست کردیا گیا، اس ذلت آمیز کارروائی سے تمام ہندوستانی فوجی بھڑک اٹھے، انھوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ اب خاموش نہیں بیٹھیں گے اور اس کا انتقام لیں گے، اس واقعے کے اگلے ہی دن ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی فوجیوں نے علم بغاوت بلند کردیا، جیل خانے تباہ کردئے، بیرکیں جلادیں اور ان پچاسی ساتھیوں کو انگریزی فوج کی قید سے آزاد کرالیا جن کو حکم عدولی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، ساتھ ہی ایسے آٹھ سو قیدیوں کو بھی رہا کرالیا جو کسی دوسرے جرم کی سزا کاٹ رہے تھے، انگریزی فوج نے مزاحمت کی تو ان کو گولیوں سے بھون ڈالا۔

یہ تمام ہندوستانی فوجی اسی رات پیادہ پا دہلی روانہ ہوگئے، اس وقت دہلی میں

بہادر شاہ ظفر تخت نشیں تھے، انگریزوں نے انہیں برائے نام بادشاہت کے منصب پر باقی رکھا تھا، عملی طور پر انہیں نہ کوئی اختیار تھا اور نہ ان کا کوئی حکم چلتا تھا، میرٹھ سے دہلی پہنچنے والے فوجیوں کو دیکھ کر دہلی میں ہندوستانی فوجی بھی مشتعل ہوگئے، اور وہ بھی اپنی چھاؤنیوں سے نکل کر لال قلعے کی طرف بڑھنے لگے جہاں بہادر شاہ ظفر اپنے اہل خاندان کے ساتھ قیام پذیر تھے، یہ واقعہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان باقاعدہ جنگ کے آغاز کا اعلان تھا۔

انگریزوں نے انقلابیوں کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی، مصالحت بھی چاہی لیکن انقلاب پسندوں کا جوش جہاد اس قدر بڑھا ہوا تھا اور انگریزوں کے خلاف ان کی ناراضگی اتنی زیادہ ہوچکی تھی کہ انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی، یہاں تک کہ لال قلعہ میں جو انگریزی افسر انقلابیوں سے بات چیت کرنے اور انہیں سمجھانے آیا تھا اس کو بھی قتل کر ڈالا، ان کے غیظ وغضب کا یہ حال تھا کہ انہیں راہ چلتے جو بھی انگریز فوجی ملتا اسے قتل کر ڈالتے، ان واقعات سے انگریز حواس باختہ ہوگیا، جلدی ہی اس کی فوجیں شہر سے نکل کر ایک اونچی جگہ مقیم ہوگئیں، انگریزوں سے جذبۂ انتقام کی آگ چاروں طرف پھیل گئی، کئی شہروں سے انگریزوں کو باہر نکال دیا گیا۔

علماء میدان جہاد میں:

اس دوران علماء بھی کھل کر میدان میں آگئے، اگرچہ در پردہ بہت سے علماء انگریزوں کے خلاف اپنی جہادی مہم جاری رکھے ہوئے تھے، لیکن دہلی کی صورت حال نے انہیں سخت فیصلہ لینے پر مجبور کردیا، اس وقت کے تقریباً تمام مشہور ومعروف علماء نے جہاد کا فتوی جاری کیا، اور وعظ وتقریر کے ذریعے مسلمانوں تک یہ بات پہنچائی گئی کہ ان حالات میں جہاد کرنا فرض عین ہے، اس فتوے نے جلتی پر تیل کا کام کیا، پورے ملک سے جانبازوں کے قافلے دہلی پہنچنے لگے، ادھر انگریز بھی اپنی حکمت علمی بنانے میں مصروف تھا، انقلابیوں میں جوش تو بہت تھا، ہر شخص انگریزوں کو مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا لیکن نہ ان کے

پاس تنظیم تھی، نہ مناسب مقدار میں اسلحہ تھا، اس لیے وہ انگریزوں کی منظم طاقت کے سامنے پوری طرح ثابت قدم نہ رہ سکے، حالاں کہ روہلہ کے ایک تجربہ کار کمانڈر جنرل بخت خاں بھی اپنی فوج کے ساتھ دہلی پہنچ چکے تھے اور انھوں نے اس جنگ کی کمان سنبھال لی تھی، چار مہینے تک یہ جنگ چلتی رہی، لوگ شہر دہلی اور مغلیہ سلطنت کے آخری چشم وچراغ کی حفاظت کرتے رہے، دوسری طرف انگریز نے بھی اپنے تازہ دم دستوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ جاری رکھا، ۱۴/ستمبر کو انگریز اور سکھ فوجوں نے کشمیری دروازہ توڑ ڈالا، اور لال قلعے کی طرف بڑھنے لگے، ادھر بہادر شاہ ظفر نے خطرہ محسوس کرکے لال قلعہ چھوڑ دیا، اور ہمایوں کے مقبرے میں آکر فروکش ہوگئے، انگریزوں کی پیش قدمی کا سلسلہ جاری رہا، انقلابی فوجیں مزاحمت کرتی ہوئی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتی رہیں، بالآخر ۲۰/ستمبر کو انگریزی فوجیں انقلابیوں کا قتل عام کرتے ہوئے لال قلعے میں داخل ہوگئیں، اور اس کی بلند فصیل پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا دیا گیا، بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا گیا، اس طرح یہ تحریک انقلاب بھی ناکام ہوگئی۔

جہاد شاملی وتھانہ بھون:

میرٹھ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی جو چنگاری اٹھی اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تھانہ بھون بھی اس سے مستثنی نہ رہا، ان دنوں تھانہ بھون کو پورے علاقے میں ایک نمایاں مرکزی حیثیت حاصل تھی، بڑا خوش حال قصبہ تھا، انگریزوں نے یہاں ایک فوجی بھرتی سینٹر بھی قائم کر رکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس قصبے کے بیشتر جوان انگریزی فوج میں بھرتی تھے، پینتیس ہزار کی آبادی میں سات ہزار فوج میں تھے، ان میں سے اکثر میرٹھ میں تعینات تھے، کارتوس کے قضیے میں تمام مسلمان فوجیوں نے ملازمتیں چھوڑ کر یا تو دہلی کا رخ کیا، یا اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے، ایسے ہی کچھ فوجی جوان جب تھانہ بھون واپس آئے تو انھوں نے انگریزوں کے خلاف ماحول بنانا شروع کردیا، اس دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ تھانہ بھون کے ایک مشہور رئیس قاضی عبدالرحیم ہاتھی خریدنے کے

لیے سہارن پور تشریف لے گئے، اس وقت ہاتھی ایک بڑی فوجی جنگی طاقت کی شکل میں دیکھا جاتا تھا، انگریزوں کو بتلایا گیا کہ قاضی صاحب بغاوت کے لیے ہاتھی خرید رہے ہیں، انگریزوں نے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا۔

قاضی عبد الرحیم کو پھانسی دئے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تھانہ بھون واطراف میں پھیل گئی، قاضی عبد الرحیم کے بھائی قاضی عنایت علی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی، خاندان کے لوگ آگ بگولہ ہو گئے اور انھوں نے انگریزوں کو سبق سکھلانے کی ٹھان لی، پورے علاقے میں جہاد جہاد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

علماء حق بھی ان واقعات سے بیگانہ نہیں تھے، بلکہ ان کے دلوں میں تو انگریزوں کے خلاف پہلے ہی سے لاوا پک رہا تھا، وہ صرف موقع کے منتظر تھے، چناں چہ تھانہ بھون میں علماء کا ایک مشاورتی اجتماع ہوا، جس میں اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے جھنجھانہ، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ تک سے علماء کو بلایا گیا، اجتماع کی صدارت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے فرمائی، تقریباً تمام حضرات علماء نے جہاد کی مشروعیت اور ضرورت پر اتفاق کیا، حضرت حاجی صاحب کو امیر منتخب کیا گیا، سب سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ نے حاجی صاحب کے دست حق پر بیعتِ جہاد کی، پھر تمام حاضرین نے جہاد کا عہد کیا۔

بیعت جہاد کے بعد ان حضرات نے تھانہ بھون واطراف میں حضرت حاجی صاحبؒ کی قیادت وامارت میں متوازی حکومت قائم کی، انگریزوں کے ماتحت حکام قصبے سے باہر نکال دئے گئے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ عوام کی شرعی رہ نمائی، اور حکومتی کاموں میں حضرت حاجی صاحب کا ہاتھ بٹانے کے لیے تھانہ بھون ہی میں مقیم ہو گئے، گویا جہاد کا پورا پورا ماحول تیار ہو گیا، اطراف واکناف سے آزادی کے متوالے جوق در جوق تھانہ بھون میں جمع ہو گئے، ایک اچھی خاصی فوج تیار

ہو گئی، جہاد کا اعلان کر دیا گیا، انگریزی فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔

ضلع مظفر نگر کا قصبہ شاملی ان دنوں انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی، وہاں کمپنی کی حکومت کا خزانہ بھی تھا، انگریزوں کو خوف ہوا کہ یہ مجاہدین کہیں خزانہ نہ لوٹ لیں، اس لیے اطراف سے انگریزی فوجی دستے شاملی پہنچنے لگے، ایسا ہی ایک فوجی دستہ سہارن پور سے شاملی کے لیے روانہ ہوا خبر آئی کہ فوجی دستے کے ساتھ توپ خانہ بھی ہے، خبر سے تشویش پیدا ہوئی، کیوں کہ مجاہدین کے پاس صرف تلواریں اور بندوقیں تھیں، ایسا کوئی اسلحہ نہ تھا جس سے توپ خانے کا مقابلہ کیا جا سکے، مجاہدین نے ہمت نہ ہاری، جو سڑک سہارن پور سے شاملی کی طرف جاتی ہے، اس کے کنارے ایک باغ تھا، حضرت گنگوہیؒ نے امیر المؤمنین کی اجازت وحکم سے تیس چالیس مجاہدین اپنے ساتھ لیے اور رات کو سڑک کے کنارے واقع اس باغ میں چھپ کر بیٹھ گئے، مجاہدین سے فرمایا کہ جس وقت رات کو توپ خانہ ادھر سے گزرے گا میں تم کو اشارہ کروں گا تم سب بہ یک وقت فائر کر دینا، چناں چہ رات کو جس وقت توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزرا تمام مجاہدین نے اپنی بندوقیں چلا دیں، انگریز فوجی اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے، اور توپ خانہ چھوڑ کر فرار ہو گئے، مجاہدین سڑک سے توپ خانہ گھسیٹتے ہوئے لائے اور اسے حاجی صاحب کی خانقاہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

اس واقعے سے حوصلہ پا کر مجاہدین نے شاملی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، مقصد یہ تھا کہ شاملی سے فوجی چھاؤنی ختم کر دی جائے، اور اس علاقے کو بھی تھانہ بھون کی عمل داری میں شامل کر لیا جائے، حسن اتفاق سے ان دنوں وہاں سہارن پور کا کلکٹر اسپنکی بھی آیا ہوا تھا، یہ وہی شخص ہے جس نے قاضی عبد الرحیم کو پھانسی پر لٹکایا تھا، مجاہدین نے علماء کی قیادت میں شاملی کی تحصیل پر زبردست حملے کئے، فوجی ٹھکانوں پر چھاپے مارے، اس وقت اس فوج میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ،

حضرت مولانا منیر احمد نانوتویؒ جیسے اکابر علماء بھی موجود تھے، انگریزی فوج ان پے در پے حملوں سے پسپا ہو کر تحصیل کی عمارت میں قلعہ بند ہوگئی، صدر دروازہ بند کرلیا، اور دیواروں میں سوراخ کر کے مجاہدین پر گولیاں برسانے لگی، دو دن تک مسلمان مجاہدین تحصیل کی عمارت کے چاروں طرف پھیلے رہے، اور انگریز گولیاں برساتے رہے، مجاہدین کو کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا، تیسرے روز حافظ ضامن شہید نے کسی طرح تحصیل کا مضبوط دروازہ توڑ ڈالا، مجاہدین اندر گھس گئے، آمنے سامنے کی جنگ میں سینکڑوں انگریز مارے گئے، بہت سے مجاہدین نے بھی جام شہادت نوش کیا، انگریزوں کی تعداد زیادہ تھی، ان کے پاس اسلحہ بھی زیادہ تھا، وہ لگاتار گولیاں برسا رہے تھے، اچانک ایک گولی حضرت حافظ ضامنؒ کی ناف کے نیچے لگی، آپ زمین پر گر گئے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کو اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے، اپنے زانو پر ان کا سر رکھا، اسی حالت میں وہ اپنے رب سے جا ملے، ایک گولی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سر میں بھی لگی، آپ زمین پر بیٹھتے چلے گئے، سمجھا گیا کہ گولی سر کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی، تمام کپڑے خون میں تر بہ تر ہوگئے، حضرت حاجی صاحبؒ نے آگے بڑھ کر زخم پر ہاتھ رکھا، عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں زخم نہ تھا۔

حافظ ضامنؒ کی شہادت سے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی، دشمنوں کی فوج کو حوصلہ ملا اور انھوں نے مسلمانوں پر لگاتار حملے کیے، بالآخر مسلمانوں کی پسپائی ہوئی اور وہ تھانہ بھون واپس ہوگئے۔

انگریزی فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کرلیا، جانبین سے گولہ باری ہوئی، اس جنگ میں دونوں فریقوں کے تقریباً ۵۰۰ افراد کام آئے، کچھ دنوں کے بعد انگریزوں نے سکھ آرمی کی مدد سے تھانہ بھون پر دوسرا بڑا حملہ کیا، جس نے پورے قصبے کو تباہ کردیا، فصلیں توڑ کر انگریزی فوج قصبے میں داخل ہوگئی، دکانیں لوٹ لی گئیں، مکانات تباہ و برباد کردئے گئے، جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان کو درختوں پر لٹکا کر سولی دے دی گئی، ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے بعد جب یہ قصبہ دوبارہ آباد ہوا اس وقت بھی ۱۳۲ نعشیں درختوں سے لٹکی

ہوئی تھیں، حضرت حاجی صاحبؒ مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کر گئے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کہیں روپوش ہوگئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو مظفر نگر کی جیل میں قید کردیا گیا۔

تحریک ریشمی رومال:

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد اکابرین دیوبند نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لیے ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، اس ادارے کے قیام کا مقصد صرف پڑھنا پڑھانا نہیں تھا بل کہ ایسے رجال کار تیار کرنا بھی تھا جو اسلام کے خلاف ہونے والے تمام فتنوں اور سازشوں کا مقابلہ کرسکیں، خدا گواہ ہے کہ دار العلوم دیوبند نے اپنے قیام کا مقصد پوری طرح حاصل کیا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد استخلاص وطن کے لیے جس قدر بھی تحریکیں اس ملک میں برپا ہوئیں ان سب میں اس ادارے کے علماء اور فضلاء نے بھرپور حصہ لے کر ثابت کیا ہے کہ ان کے دلوں میں حصول آزادی کی وہ تمنا شعلہ بن کر بھڑک رہی ہے جس کی چنگاری سراج الدولہؒ، ٹیپو سلطانؒ، سید احمد شہیدؒ اور حضرت حاجی امداد اللہؒ اور ان کے رفقا کی ناکام جدوجہد آزادی کی بجھی ہوئی راکھ میں کہیں چھپ گئی تھی۔

ابھی دار العلوم کے قیام کو دس سال گزرے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سربراہی میں انجمن ثمرۃ التربیۃ کا قیام عمل میں آیا جس میں بڑے بڑے علماء شامل تھے، انجمن کے روح رواں شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے، اس انجمن سے صرف فضلائے دار العلوم اور منتسبین دیوبند کی تنظیم مقصود نہ تھی بل کہ ایسے باحوصلہ افراد کو جمع کرنا بھی تھا جو قیام دار العلوم کے مقصد کی تکمیل کرسکیں اور ۱۸۵۷ء کے ادھورے کام کو پورا کرسکیں، افسوس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے وصال کے بعد انجمن کی سرگرمیوں کا سلسلہ اس طرح جاری نہ رہ سکا جس طرح جاری رہنا چاہیے تھا۔

کچھ سال بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایسے ہی کچھ مقاصد کے لیے انجمن جمعیۃ الانصار بنائی، اس عرصے میں لگ بھگ تیس سال تک وہ اپنے شاگردوں کی ذہن سازی کرتے

رہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس کے ناظم بنائے گئے، جمعیۃ الانصار نے مرادآباد، میرٹھ اور شملہ میں بڑے بڑے اجلاس منعقد کیے، جس میں علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جمعیۃ کی مقبولیت سے انگریزوں کی نیند حرام ہوگئی، جمعیۃ الانصار نے جس قدر عوامی طاقت کا مظاہرہ کیا اس نے حکومت برطانیہ کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا، چناں چہ ارباب حکومت نے دارالعلوم دیوبند ہی کو اپنا نشانہ بنالیا جس کے پہلو سے اس تحریک نے جنم لیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کو دارالعلوم کی بقا کی فکر دامن گیر ہوئی، آپ نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ سمیت تمام سرکردہ افراد سے کہا کہ وہ جمعیۃ الانصار سے مستعفی ہوجائیں تاکہ دارالعلوم دیوبند پر کوئی آنچ نہ آئے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ جمعیۃ الانصار سے مستعفی ہوگئے، انھوں نے نظارۃ المعارف کے نام سے ایک نئی انجمن بنائی جس کا دفتر دہلی میں رکھا، اس انجمن کے مقاصد میں بھی انگریزی استعمار کے خلاف ذہن سازی کرنا تھا، اس نئی تنظیم کا ہدف صرف آزادئ ہند تھا۔

ادھر ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی اور برطانیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو انگریزوں نے اپنی پوری طاقت اس جنگ میں جھونک دی، ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے شمالی مغربی سرحدوں پر آزاد قبائل کے ذریعے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے خاص شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ کیا تاکہ وہ قبائلی سرداروں سے مل کر ممکنہ بغاوت کے امکانات کا جائزہ لیں، اس واقعے سے بہت پہلے حضرت شیخ الہندؒ مختلف مقامات پر اپنے مراکز قائم کر چکے تھے، اور خاموشی کے ساتھ لوگوں سے جہاد پر بیعت لے رہے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور ان کے رفقاء بھیس بدل کر افغانستان پہنچ چکے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کا منصوبہ یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر افغانستان، ہندوستان پر حملہ کردے، اور اندر سے سرحدی و قبائلی اور دیگر علاقوں کے مجاہدین اٹھ کھڑے ہوں، انگریزوں کو ان حالات میں یقیناً شکست سے دوچار ہونا پڑتا، والئ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں نے اس منصوبے پر رضامندی ظاہر کی مگر وہ چاہتے تھے کہ پہلے انڈین نیشنل کانفرنس کے

بڑے لیڈروں سے کوئی بات چیت ہوجائے اور مستقبل کے لیے کوئی لائحۂ عمل تیار کرلیا جائے۔

ادھر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی یہ سرگرمیاں جاری تھیں، دوسری طرف حضرت شیخ الہندؒ خود افغانستان، یاغستان اور ترکی کے سفر کا ارادہ کیے بیٹھے تھے، اور اس سلسلے میں مشورے ہو رہے تھے کہ اچانک ڈاکٹر مختار انصاری اور دوسرے باخبر حضرات کے ذریعے سے یہ اطلاع ملی کہ حضرت شیخ الہندؒ کا تمام منصوبہ حکومت برطانیہ کے علم میں آچکا ہے، اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اب براہ راست ان ملکوں کا سفر نہ کیا جائے بل کہ حج کے ارادے سے حجاز مقدس کے لیے رخت سفر باندھا جائے اور وہاں جا کر مستقبل کا لائحۂ عمل طے کیا جائے، چناں چہ آپ ۶/ستمبر ۱۹۱۵ء کو اپنے چند رفقاء کے ساتھ بمبئی ہوتے ہوئے حجاز پہنچ گئے، راستے میں ہر جگہ ہزاروں لوگ رخصت اور ملاقات کے لیے موجود تھے، حکومت گرفتار کرنا چاہتی تھی، مگر اس کی یہ بھی کوشش تھی کہ گرفتاری خاموشی کے ساتھ ہو تاکہ مسلمان مشتعل نہ ہوں، اس لیے حکومت نے یہ طے کیا کہ گرفتاری بمبئی میں عمل میں لائی جائے، لیکن گرفتاری کے احکامات بمبئی پولیس کے پاس اتنی تاخیر سے پہنچے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی روانگی عمل میں آگئی، عدن اور جدہ کے گورنروں کو بھی گرفتاری کے احکامات روانہ کیے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بہ حفاظت مکہ مکرمہ پہنچادیا۔

حجاز مقدس پہنچ کر آپ نے گورنر مکہ غالب پاشا اور ترکی کے وزیر جنگ سے ملاقات کی، اور ان کے سامنے ہندوستان کو آزاد کرانے کا منصوبہ رکھا، ان لوگوں نے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور اس سلسلے میں ہندوستان کے قبائلی علاقوں کے سرداروں کو متعدد خطوط بھی لکھے، یہ خطوط حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ایک مخلص دوست مولانا ہادی حسن کے سپرد کیے تاکہ ان کو قبائلی سرداروں تک پہنچایا جاسکے، حکومت برطانیہ کو ان خطوط کا علم تو ہوگیا مگر وہ یہ نہ جان سکی کہ خطوط کس کے پاس ہیں۔

غالب پاشا کے جو خطوط حضرت شیخ الہندؒ نے روانہ کیے تھے ان کی نقلیں قبائلی

علاقوں میں مولانا محمد میاں نے پہنچائیں، مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے افغانستان کے قیام کے دوران جو کارہائے نمایاں انجام دئے جیسے خطوط کی ترسیل، عارضی حکومت کی تشکیل، جنود ربانیہ کا قیام اور ان کے ذمہ داروں کی تقرری ان تمام امور کی تفصیلات سے حضرت شیخ الہند کو باخبر کرنا بھی ضروری تھا، اس غرض سے چند خطوط لکھے گئے، تاریخ حریت میں یہ خطوط ریشمی خطوط کے نام سے مشہور ہیں، یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر مشتمل تھے، ان پر عبید اللہ کے دستخط ہیں اور ۹/۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کی تاریخ درج ہے، یہ تینوں خطوط مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے ایک معتمد خاص عبد الحق کو دے کر سندھ روانہ کیا کہ وہ شیخ عبد الرحیم تک پہنچا دے جو تحریک شیخ الہند کے ایک اہم رکن تھے اور وہ انہیں لے کر حجاز چلے جائیں، افسوس عبد الحق کی کوتاہی کی بنا پر یہ خطوط برطانوی حکومت کے وفادار حق نواز خاں کے ہاتھ لگ گئے اور اس نے پنجاب کے گورنر مائیکل اڈوائر کے حوالے کر دئے۔

اس درمیان حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس سے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد تک پہنچنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ والیٔ مکہ شریف حسین نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، غالب پاشا جو آپ کا قدر دان اور مخلص تھا برطرف کر دیا گیا، شریف حسین برطانیہ کا وفادار تھا، اس نے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جدہ اور جدہ سے مصر اور مصر سے مالٹا روانہ کر دیا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی آپ کے ساتھ گرفتار ہوئے اور آپ ہی کے ساتھ مالٹا کی قید میں رہے، اس طرح یہ تحریک حریت بھی ناکام ہوگئی۔

اس مضمون میں ہم نے کچھ بڑی تحریکوں کا ذکر کیا ہے، ان تحریکوں نے استخلاص وطن کے لیے کی جانے والی جد وجہد کو ایک نیا رُخ اور ایک نیا موڑ دیا ہے، اگر یہ انقلابی تحریکیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن تھا ہم ابھی تک غلام ہی ہوتے، بعد میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ نے جو تحریک چلائی وہ ان ہی تحریکوں کی صدائے بازگشت ہے، اس مضمون کے ذریعے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جد وجہد آزادی کے لیے

بڑی قربانیاں دی ہیں، ہزاروں لاکھوں علماء اور عوام نے حصول آزادی کے لیے اپنی جان کے نذرانے پیش کئے ہیں، قید و بند اور جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کی ہیں، تب کہیں جا کر آزادی اور آزادی کے بعد جمہوریت ملی ہے، آج ہم جمہوریت کا لطف اٹھا رہے ہیں، ہمارے بزرگوں نے ہمارے روشن مستقبل کے لیے کتنی مشقتیں برداشت کی ہیں اس مختصر تحریر سے ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، تاریخ کی کتابیں ان کی قربانیوں کے واقعات سے بھری پڑی ہیں، یہ مضمون ایسی ہی کچھ کتابوں کا نچوڑ ہے۔

مآخذ و مراجع

نقش حیات: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ
تحریک شیخ الہندؒ: حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ
علماء ہند کا شاندار ماضی: حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ
علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے: حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ
تاریخ دیوبند: جناب سید محبوب رضویؒ
تحریک آزادی اور مسلمان: مولانا اسیر ادرویؒ
تحریک آزادیٔ ہند میں علماء اور عوام کا کردار: مفتی سید سلمان منصور پوری

یہ کیسی جمہوریت ہے

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو نئے آئین کے نفاذ کے ساتھ اسے جمہوری ملک قرار دے دیا گیا، اس وقت سے آج تک ہم ۲۶ر جنوری کو یوم جمہوریت کے طور پر مناتے ہیں، اس دن کی بھی ایک الگ تاریخ ہے، دراصل آزادی سے پہلے ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے انگریز حکمرانوں سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا اس وقت یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا، کانگریس کے رہنماؤں نے طے کیا کہ ہم یہ دن ہر سال یوم آزادی کے طور پر منائیں گے، چناں چہ حصول آزادی تک یہ دن یوم آزادی کے طور پر منایا جاتا رہا، یہاں تک کہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو وہ آزادی حاصل ہوگئی جس کی ابتدا ۱۷۵۷ء سے ہوئی تھی، ابتدا میں آزادی کے حصول کی خواہش ایک چنگاری تھی جو ۱۸۵۷ء کے آتے آتے ایک شعلۂ جوالہ بن گئی، اس وقت یہ شعلہ صرف مسلمانوں کے دلوں میں بھڑک رہا تھا اور وہی انگریزوں کے نشانے پر بھی تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تو ناکام ہوگئی مگر وہ شعلہ اسی طرح دلوں میں بھڑکتا بجھتا رہا، انیسویں صدی کے آغاز میں پھر بھڑکا، اس وقت اس شعلے کے تپش غیر مسلموں نے بھی محسوس کی اور وہ بھی اس تحریک کا حصہ بنے، دونوں قوموں کی انتھک جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں آزادی حاصل ہوگئی، اس وقت یہاں انگریزوں کے قوانین رائج تھے، آزادی کے پندرہ دن کے بعد ۲۹ر اگست ۱۹۴۷ء کو طے کیا گیا کہ آزاد ہندوستان کا اپنا آئین بنایا جائے جس میں اس ملک کے تمام باشندوں کے حقوق کا تحفظ بھی ہو اور ان کی خوش حالی اور پرامن زندگی کی ضمانت بھی، اس مقصد کے

لیے دستور ساز اسمبلی نے سات افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کے صدر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر تھے، اس کمیٹی نے دو سال گیارہ مہینے اٹھارہ دن یعنی تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ملک کا آئین تیار کیا، جسے ملک کی پارلیمنٹ نے منظور کرکے نافذ کردیا، اس آئین کی رو سے ہمارا ملک جمہوریہ ہند کہلایا۔

جمہوریت ایک طرزِ حکومت کا نام ہے اس کے متعلق ابراہام لنکن کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ ''یہ عوام کی حکومت ہے جو عوام کے لیے بنتی ہے اور عوام کے ذریعے وجود میں آتی ہے''، موجودہ دور میں اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرزِ حکومت پسندیدہ نہیں ہے، اسی لیے دنیا کے اکثر ملکوں میں جمہوریت قائم ہے اور جہاں جمہوریت نہیں ہے وہاں داخلی اور خارجی عناصر کے ذریعے اس کے قیام کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا ہے، آیئے یہ دیکھیں کہ آخر یہ طرز حکومت ہے کیا چیز؟ کیا واقعی ہمارا ملک جمہوریت کے تقاضوں کی تکمیل کررہا ہے یا اس راستے سے بھٹک گیا ہے جس پر جمہوری دستور کے خالقوں نے اسے چلانے کی کوشش کی تھی؟۔

اس دنیا پر ایک وقت وہ بھی گذرا ہے جب کوئی کسی کا پابند نہیں تھا، نہ سلطنتیں تھیں، نہ سرحدیں تھیں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما تھا، جو جتنا طاقت ور ہوتا وہ اسی قدر کمزوروں پر حکومت کرتا، آہستہ آہستہ ملک وجود میں آتے گئے اور اسی کے ساتھ ان ملکوں میں حکومتیں بھی بننے لگیں، عموماً شخصی حکومتیں وجود میں آئیں جن میں شخص واحد حکمراں قرار پاتا وہ مرجاتا تو اس کے وارثین میں سے کوئی اس کی جگہ لیتا، بعض اوقات کوئی زیادہ طاقت ور شخص زور وزبردستی سے اس کو معزول کردیتا اور خود اس کی جگہ بیٹھ جاتا، اسلام کی آمد سے پہلے عموماً اسی طرح کی سلطنتیں تھیں، یا لوگ قبیلوں میں تقسیم تھے، ہر قبیلے کا اپنا حاکم، اپنا دستور اور اپنی فوج تھی، حاکم یا بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ہی قانون تھا، زمانہ تمدن کی طرف بڑھا تو ایسی حکومتیں بھی وجود میں آئیں جو اگرچہ شخصی تھیں مگر حکومت کرنے والے اپنے ملکی اور قبائلی رواج کے پابند بھی تھے اور وہی قدیم رسم ورواج ان حکومتوں کا آئین تھا، بادشاہ وقت کو بھی اس سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ تھی، آہستہ آہستہ

دنیا تبدیلی کی طرف بڑھی اور بادشاہ کو بھی دستور کا پابند بنایا جانے لگا، یہاں تک کہ ایسی حکومتیں بننے لگیں جن میں اگرچہ اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتا، مگر وہ پہلے کی بہ نسبت کسی قدر کم بااختیار ہوتا، اصل اقتدار کا سرچشمہ پارلیمنٹ ہوتی یا کوئی اور کمیٹی جو آئین کے نفاذ کے لیے تشکیل دی جاتی۔

ایک طرح سے ان حکومتوں میں شورائی نظام رائج تھا، کچھ اہل رائے بادشاہ کو مشورے دیتے اور بادشاہ ان پر عمل کرنے کا پابند ہوتا، اب صورت حال یہ ہے کہ زیادہ تر دنیا سے بادشاہتیں ختم ہوگئی ہیں، ان کی جگہ جمہوری حکومتوں نے لے لی ہے، جو چند ملک جمہوریت سے دور ہیں ان میں بھی آوازیں اٹھنے لگی ہیں، وہاں کے حکمرانوں نے نچلی سطح سے جمہوریت کا عمل شروع بھی کر دیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب یہ عمل اوپر کی سطح تک پہنچ جائے گا، اس وقت بلاشبہ یہ کہا جائے گا کہ ساری دنیا میں جمہوری انقلاب برپا ہو چکا ہے اور اب ہر ملک میں عوام کی حکومت قائم ہے جسے خود عوام نے منتخب کیا ہے اور وہ عوام کی فلاح کے لیے کام کرنے کی پابند ہے۔

اگرچہ جمہوریت کا بھی کوئی ایک پیمانہ مقرر نہیں ہے، مختلف ملکوں میں مختلف طرح کی جمہوریتیں ہیں، کہیں صدارتی طرزِ حکومت ہے اور وہاں کے صدر کو پارلیمنٹ سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں، کسی ملک میں صدر محض ربڑ اسٹامپ ہے، اس طرح کے ملکوں میں پارلیمنٹ کو برتری حاصل ہوتی ہے اور اس کے بخشے ہوئے اختیارات کی روشنی میں وزراء کا ایک گروپ حکومت چلاتا ہے، جمہوری حکومت کسی بھی نوعیت کی ہو سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ اسے عوام اپنی رائے سے ایک خاص مدت کے لیے منتخب کرتے ہیں، مدت گزرنے کے بعد اس حکومت کے ذمہ داروں کو پھر عوام کے سامنے جانا پڑتا ہے، اگر عوام ان کی کارکردگی سے مطمئن ہوں تو انہیں دوبارہ حکومت کرنے کا موقع دیتے ہیں ورنہ واپس بھیج دیتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اس طرزِ حکومت میں طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔

اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی جمہوری حکومت قائم ہے اس کی نوعیت

نیابتی جمہوریت کی ہے، اس صورت میں ملک کے وہ عوام جو قانونی طور پر ووٹ دینے کا حق رکھتے ہوں اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو ان کی جگہ حکومت کرتے ہیں، اکثر ملکوں میں دو پارٹی سسٹم نافذ ہے، سیاست دانوں نے اپنے منشور کو بنیاد بنا کر کچھ پارٹیاں بنالی ہیں، جو الیکشن کمیشن کے ذریعے طے شدہ حلقوں میں اپنے نمائندے کھڑے کرتی ہیں، جس پارٹی کے زیادہ نمائندے کامیاب ہو کر آجاتے ہیں حکومت اسی پارٹی کی بنتی ہے، برطانیہ میں یہی طرزِ حکومت ہے، ہمارے ملک میں بھی آزادی کے بعد سے یہی طریقہ کار چلا آرہا ہے، لیکن کیوں کہ یہ ملک رقبے اور آبادی کے لحاظ سے نہایت وسیع ملک ہے، نسلی، لسانی اور طبقاتی کش مکش بھی یہاں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے، اس لیے دو پارٹی سسٹم کا نظریہ یہاں عملی طور پر کامیاب نہیں ہو سکا، کچھ سیاست دانوں کی خود غرضی اور اقتدار کے لیے ان کی بے پناہ لالچ اور خواہش نے بھی علاقائی اور طبقاتی اختلاف کو مسلسل ابھارنے کی کوشش کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ملک میں الیکشن قومی مفاد کے بجائے علاقائی مفاد کی بنیاد پر لڑا جارہا ہے، کامیاب امیدوار محدود طبقاتی اور علاقائی مفادات پر لب کشائی کرتے ہیں، جب کہ اہم قومی معاملات نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک کے لیے جمہوریت سے بہتر کوئی طرزِ حکومت نہیں ہے لیکن ہم نے جمہوریت کے نام پر جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اسے حقیقی جمہوریت کے بجائے اس کا طلسم یا فریب کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے، کثیر پارٹی سسٹم نے جمہوریت کی حقیقی روح اس قدر مجروح کر دی ہے کہ لوگ اس سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے ہیں، ملک کا سنجیدہ طبقہ جمہوریت کے متعلق عوام کی اس بے اعتنائی پر خاصا فکرمند ہے اور اسے سیاست دانوں کی خود غرضی کا شاخسانہ قرار دیتا ہے، پارٹیوں کی کش مکش نے ملک کے وقار کو خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے، جو لوگ اقتدار میں ہیں وہ مخالفین کو اقتدار سے دور رکھنے کے لیے اور جو اقتدار میں نہیں ہیں وہ حریفوں کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار رہتے ہیں، ہوتا ہے یہ کہ اگر برسرِ اقتدار طبقہ ملک کے مفاد

میں کوئی تجویز لے کر آتا ہے تو اپوزیشن گروپ اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، بعض اوقات اپوزیشن نے حکمراں پارٹی کی ان امور میں مخالفت کی ہے جن کو وہ اپنے دور حکومت میں ہری جھنڈی دکھلا چکی تھی، رام سیتو پل کی مثال ہمارے سامنے ہے حالاں کہ اس کی اجازت بی جے پی کے دور حکومت میں دی گئی، لیکن جب کانگریس نے اس تجویز پر عمل شروع کیا تو اس کی یہ کہہ کر مخالفت کی گئی کہ یہ ایک فرقے کے مذہبی جذبات کے خلاف ہے، اس طرح بہت سی تعمیری کوششیں اپوزیشن کی خود غرضانہ سیاست کی نذر ہو جاتی ہیں اور ملک کو نا قابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

کثیر پارٹی سسٹم کی موجودگی میں انتخاب کے طریقۂ کار میں ایک بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں کامیابی کا فیصلہ دیئے گئے ووٹوں میں اکثریت کے تناسب پر ہوتا ہے، رائے عامہ کی اکثریت کے تناسب پر نہیں ہوتا، فرض کیجئے کسی حلقے سے دس امیدوار میدان میں ہیں عموماً الیکشن میں چالیس سے پچاس فی صد تک ووٹ ڈالے جاتے ہیں، گویا رائے عامہ کی نصف تعداد الیکشن میں حصہ ہی نہیں لیتی، باقی نصف تعداد دس امیدواروں میں بٹ جاتی ہے، فیصلہ اس امیدوار کے حق میں کر دیا جاتا ہے جو باقی نو امیدواروں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ حاصل کرتا ہو، خواہ وہ زیادتی ایک ہی ووٹ کی کیوں نہ ہو، اس طرح اگر ناکام امیدواروں نے کل ووٹ کا اسی فی صد حصہ لے لیا، تو وہ سب ناکام ہیں کیوں کہ جس امیدوار نے بیس فی صد ووٹ حاصل کئے ہیں وہ کامیاب قرار دیا جائے گا، گویا جمہوریت کی بنیاد کل رائے دہندگان کے پچاس فی صد پر ہے اور پچاس فی صد میں سے بھی صرف دس فی صد ووٹ حاصل کرنے والوں کو اقتدار سنبھالنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، چالیس فی صد ووٹ دینے والوں کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوتی۔

انتخابی طریقۂ کار نے ملک کو بڑی حد تک جمہوریت کی حقیقی اقدار سے محروم کر دیا ہے، جمہوریت کے نام پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے خواہ وہ اس رائے کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف ہے یا نہیں، یہ ایک ایسی خامی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے نمائندے منتخب ہو کر قانون ساز اداروں میں پہنچ جاتے ہیں جو

اس کے اہل نہیں ہوتے، ان کے مقابلے میں بہت سے ایسے لوگ ناکام رہ جاتے ہیں جو حقیقی معنی میں اہل ہوتے ہیں اور جن سے ملک کی خدمت کی توقع کی جا سکتی ہے، ممتاز ماہرینِ سیاست اور قانون دانوں کے مقابلے میں فلمی اداکاروں کی کامیابی کو اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ہمارے ملک کی اکثریت اتنی بالغ نظر نہیں ہے کہ وہ ناچنے گانے والوں اور معیشت اور قانون کے ماہرین میں فرق کر سکے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے قانون ساز اداروں میں نا اہل نمائندوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے اور اہل لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں، اس صورت حال نے ملک کے ذمہ دارانہ مناصب پر ایسے لوگوں کو بٹھلانے پر مجبور کر دیا ہے جو ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔

اس سے بھی بڑھ کر دوسری خرابی یہ ہے کہ عمر کی تحدید کو چھوڑ کر ہر شخص انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے خواہ وہ تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے اس کی اہلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس بلا قید و شرط استحقاق کی بنا پر ایوانہائے نمائندگان میں ہر پانچ سال میں ایسے افراد اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں جو نہ ملکی اور قومی مسائل پر اظہار خیال کر سکتے ہیں اور نہ ان میں اتنی لیاقت ہوتی ہے کہ کسی معاملے میں اپنے طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں یا از خود کوئی فیصلہ کر سکیں، وہ صرف پارٹی کے وفادار ہوتے ہیں اور پارٹی کے بڑے لیڈروں کے چشم و ابرو کے اشاروں پر ناچتے ہیں، معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تو غنیمت تھا، افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ عرصے سے مجرمانہ پس منظر رکھنے والے لوگ بھی انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور رائے دہندگان کی بے شعوری سے فائدہ اٹھا کر یا خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر کے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، اس طرح ہمارے قانون ساز ادارے جرائم پیشہ لوگوں کی پناہ گاہ بنتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں ملک کا مستقبل کیا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے، ہندوستان جیسے ملکوں میں جسے تہذیبی تنوع کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہے، جمہوریت بہت خوب طرز حکومت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی تطہیر پر توجہ دی جائے اور اس کے خد و خال سنوارنے کی کوشش کی جائے۔

ہمارے ملک میں اقتصادی اور معاشرتی طور پر دبے کچلے طبقات کو نمائندگی دینے میں کافی تاخیر سے کام لیا گیا، اب کچھ سیٹیں ایسے طبقوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہیں، اسے ہماری جمہوری سیاست کا خوش گوار پہلو کہہ سکتے ہیں، خواتین کو بھی کچھ تحفظات دیئے گئے ہیں اور اب ان کی بھی قابل ذکر تعداد ایوان نمائندگان میں پہنچنے لگی ہے، مگر یہ معاملہ بھی پورے طور پر صاف شفاف نہیں ہے، اگر اِن طبقوں کو اُن حلقوں میں ریزرویشن دیا جاتا ہے جن میں ان کی اکثریت ہے یا ان کی معتد بہ تعداد موجود ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے، لیکن انتخابی سیاست کے ناخداؤں کی عقل پر اس وقت ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جب چن چن کر ان حلقوں میں تحفظات فراہم کئے جاتے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی ہے یا وہ ان حلقوں سے آسانی کے ساتھ اپنے نمائندے چن کر بھیج سکتے ہیں صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ایسا جان بوجھ کر کیا جارہا ہے تاکہ کم سے کم مسلمان کامیاب ہوں، یہی وجہ ہے کہ ہر آنے والے الیکشن میں گذشتہ کے مقابلے مسلم نمائندوں کی تعداد روبہ زوال ہوتی جارہی ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس طرح پس ماندگی کی بنیاد پر دبے کچلے طبقوں کو ریزرویشن دیا جارہا ہے اسی طرح اقلیتوں کو بھی دیا جاتا تاکہ وہ اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندے منتخب کرکے بھیج سکتے، مگر ایک مخصوص ذہنیت نے ملک کے انتخابی نظام کو تعصب کی زہریلی ہوا سے مسموم کرکے رکھ دیا ہے، وہ دن دور نہیں جب اقلیتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کی ہر کوشش کامیاب ہوتی نظر آئے گی اور وہ دن ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ کا سیاہ دن ہوگا۔

جمہوریت کا ایک خوب صورت پہلو تحریر وتقریر کی آزادی ہے، جن ملکوں میں شہنشاہیت پائی جاتی ہے ان ملکوں کے عوام آزادی کی اس نعمت سے محروم ہیں، مگر کوئی نعمت اسی وقت مفید اور قابل قدر ہوسکتی ہے جب اس کا استعمال توازن اور اعتدال کے ساتھ ہو، ہم لوگ تحریر وتقریر کے سلسلے میں ملکی قانون کے بے لچک رویتے سے شہہ پاکر اس کا بے جا استعمال کررہے ہیں، ہمارے ذرائع ابلاغ حکومت کی آنکھ میں آنکھ ملا کر بات

کرتے ہیں، انہیں ناپسندیدہ عناصر کا بھی کوئی خوف نہیں ہے، بلاشبہ سرکاری اور غیر سرکاری بدعنوانیاں میڈیا کے ذریعے سامنے آرہی ہیں یہ بہت اچھی بات ہے، لیکن یہی میڈیا جب تعصب سے کام لیتا ہے اور ملک کے ایک مخصوص مذہب کے خلاف زہر افشانی کرتا ہے تو وہ ملک وقوم کی خدمت انجام نہیں دیتا بلکہ اس ملک کی تہذیبی روایات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، آج تحریر وتقریر کی آزادی کے نام پر یہی سب کچھ ہورہا ہے، میڈیا کے ذریعے مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کیا جارہا ہے، ان کی مذہبی شخصیات پر مذہبی اقدار پر، دینی تعلیمی اور تہذیبی مراکز پر مسلسل حملے کئے جارہے ہیں، کوئی اسے لگام دینے والا نہیں ہے، کیوں کہ اس سے تحریر وتقریر کی نام نہاد آزادی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، ہماری مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو یہ آزادی محبوب ہے، خواہ وہ وطنِ عزیز کی سلامتی کی قیمت پر کیوں نہ ہو۔

ملک کو آزاد ہوئے تریسٹھ سال اور جمہوریہ بنے ساٹھ سال ہوگئے ہیں، اگر ماضی کی طرف مڑکر دیکھا جائے تو یہ آزادی اور جمہوریت محض سراب معلوم ہوتی ہے جو دور سے دیکھنے میں بڑی خوب صورت اور دلکش ہے، مگر قریب جاکر دیکھا جائے تو سیاہ چمکیلی ریت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، کیا واقعی ہمارے بزرگوں نے اسی آزادی اور جمہوریت کے لیے اپنی بیش قیمت جانیں قربان کی تھیں اور کیا ہمارے دستور ساز رہنما ایک ایسا ملک بنانا چاہتے تھے جہاں طبقاتی کش مکش ہو، جہاں پس ماندگی، غربت افلاس اور جہالت ہو، جہاں رنگ ونسل کی تفریق پر مبنی سیاست کا بول بولا ہو، جہاں اقتدار کے لیے تمام اخلاقیات اٹھا کر رکھ دی جاتی ہوں، جہاں قانون تو ہو مگر کمزوروں کے لیے، جہاں طاقت ور قانون سے بالاتر ہوں، جہاں تنگ نظری عصبیت اور فرقہ واریت ہو، جہاں بے گناہوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی جاتی ہو اور مجرم کھلے بندوں گھومتے پھرتے ہوں، اگر یہ جمہوریت ہے تو شاید ہی کسی مہذب سماج کو ایسی جمہوریت کی ضرورت ہو۔

آئین ہند کا دیباچہ، بھارت کا بنیادی اور عظیم قانون

بنیادی حقوق، ریاستی پالیسی کے رہنما اصول اور بنیادی فرائض آئین ہند کی دفعات ہیں جن میں بھارت کے شہریوں کے تئیں ریاست کی ذمہ داریوں اور ریاست کے تئیں شہریوں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں، ان دفعات میں سرکاری پالیسی سازی اور شہریوں کے ضابطہ اور رویے کے سلسلے میں آئینی حقوق کا ایک بل شامل ہے، یہ دفعات آئین کے ضروری عناصر سمجھے جاتے ہیں، جنھیں بھارت کی آئین ساز اسمبلی کی جانب سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء کے درمیان میں تیار کیا گیا تھا، بنیادی حقوق کو تمام شہریوں کے بنیادی انسانی حق کے طور پر بیان کیا گیا ہے، آئین کے حصہ سوم میں وضاحت کے ساتھ درج ہے کہ یہ حقوق نسل، جائے پیدائش، ذات، عقیدہ یا جنسی امتیاز سے قطع نظر ہر شہری پر نافذ اور مخصوص پابندیوں کی تابع عدالتوں کی طرف سے قابل نفاذ ہیں، ریاستی پالیسی کے رہنما اصول حکومت کی جانب سے قانون سازی کی ہدایات پر مشتمل ہیں، آئین ہند کے حصہ چہارم میں مذکور اصول عدالتوں کی جانب سے قابل نفاذ نہیں ہیں، لیکن جن اصولوں پر یہ مبنی ہیں وہ حکومت کے لیے بنیادی ہدایات کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے متعلق امید ظاہر کی گئی ہے کہ ریاستی قانون سازی اور منظوری میں ان پر عمل کیا جائے گا۔

حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے اور بھارت کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بنیادی فرائض کو بھارت کے تمام شہریوں کی اخلاقی ذمہ داری کے طور پر بیان کیا گیا ہے، آئین ہند کے حصہ چہارم میں مذکور یہ فرائض افراد اور قوم سے متعلق ہیں اور رہنما اصولوں کی طرح انھیں بھی قانونی طور پر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

بنیادی حقوق اور رہنما اصولوں کی بنیادیں ہندوستان کی تحریک آزادی میں ملتی ہیں، جس تحریک نے ہندوستانی معاشرے کی فلاح وبہبود اور آزادی کی اقدار کو آزاد ہندوستان کے مقاصد میں شامل کیا تھا اور انھیں حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کی۔ بھارت کے آئینی حقوق کی تیاری میں انگلستان کے حقوق بل، امریکہ کے حقوق بل اور فرانس کے حقوق انسانی اعلامیہ کا واضح اثر نظر آتا ہے، برطانوی حکمرانوں اور ہندوستانی قوم کے درمیان تفریق ختم کرنے کے لیے شہری حقوق کا مطالبہ بھارتی تحریک آزادی کا ایک اہم حصہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان پیش کی گئی قرار دادوں میں اس مطالبے کا وضاحت سے ذکر تھا، ان قرار دادوں میں ہندوستانیوں کو قانونی طور پر حق مساوات، آزادئ اظہار، مقدموں کی سماعت کرنے والی جیوری میں کم از کم نصف افراد ہندوستانی رکھنے، سیاسی طاقت اور برطانوی شہریوں کی مانند ہتھیار رکھنے جیسے حقوق عطا کرنے کے مطالبات موجود تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے تجربات ۱۹۱۹ء کے غیر اطمینان بخش مونٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں گاندھی جی کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے شہری حقوق کے مطالبات کے متعلق تحریک آزادی کے رہنماؤں کے نقطۂ نظر میں قابل ذکر تبدیلی آئی اور اب ان کی توجہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان مساوات کا حق مانگنے کے بجائے تمام ہندوستانیوں کی آزادی کو یقینی بنانے پر مذکور ہوگئی۔ ۱۹۲۵ء میں اینی بیسنٹ کی جانب سے تیار کردہ ہندوستان کے دولت مشترکہ بل میں سات بنیادی حقوق کا خاص طور پر مطالبہ کیا گیا تھا، انفرادی آزادی، ضمیر کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی، جنسی بنیاد پر عدم تفریق، بنیادی تعلیم اور عوامی مقامات کے استعمال کی آزادی، ۱۹۲۷ء میں کانگریس نے ظلم وستم پر نگرانی رکھنے والے حقوق کے اعلامیہ کی بنیاد پر ہندوستان کے ''آئین سوراج'' کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کی، ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو کی قیادت میں ۱۱ رکنی کمیٹی کا قیام عمل میں

آیا، کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تمام ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت سمیت متعدد سفارشات پیش کیں۔ یہ سفارش کردہ بنیادی حقوق امریکی آئین اور جنگ عظیم کے بعد یورپی ممالک کے اختیار کردہ حقوق سے مشابہ تھے، چناں چہ ان میں سے بہت سے حقوق ۱۹۲۵ء کے بل کے ذریعہ اختیار کر لیے گئے۔ بعد ازاں ان میں سے متعدد دفعات کو بنیادی حقوق اور رہنما اصولوں سمیت آئین ہند کے مختلف حصوں میں جوں کا توں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے کراچی اجلاس میں استحصال کے خاتمہ، سماجی تحفظ کی فراہمی اور اصلاحات زمین کے نفاذ جیسے مقاصد پر مشتمل اعلان کے ساتھ خود کو شہری حقوق اور اقتصادی آزادی کی حفاظت کے تئیں وقف کرنے کی ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد میں دیگر نئے مجوزہ حقوق میں ریاستی ملکیت کی ممانعت، حق رائے دہی، سزائے موت کے خاتمے اور آمد و رفت کی آزادی جیسے حقوق شامل تھے۔ جواہر لال نہرو کی جانب سے تیار کردہ قرارداد کے اس مسودے میں جو بعد میں بہت سے رہنما اصولوں کی بنیاد بنا، سماجی اصلاح کے نفاذ کی بنیادی ذمہ داری ریاست پر ڈالی گئی اور اسی کے ساتھ تحریک آزادی پر اشتراکیت اور گاندھی فلسفہ کے اثرات پڑنے لگے۔ تحریک آزادی کے آخری مرحلے میں ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اشتراکی اصولوں کی تکرار نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی توجہ کا اصل مرکز اقلیتی حقوق، جو اس وقت تک ایک بڑا سیاسی مسئلہ بن چکا تھا، جنھیں ۱۹۴۵ء میں سپرو رپورٹ میں پیش کیا گیا، اس رپورٹ میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ پر زور دینے کے علاوہ "قانون ساز ادارہ، حکومت اور عدالتوں کے لیے معیار اخلاق" کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔

برطانوی راج کے آخری مرحلے کے دوران ہندوستان کے کابینی مشن ۱۹۴۶ء نے اقتدار کی منتقلی کے سلسلہ میں آئین ہند کی تشکیل کے لیے ایک قانون ساز کمیٹی کی تجویز پیش کی، برطانوی صوبوں اور نوابی ریاستوں سے براہ راست منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل

ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی نے دسمبر ۱۹۴۶ء میں اپنی کارروائی شروع کی اور نومبر ۱۹۴۹ء میں آئین ہند کا مسودہ مکمل کیا، کابینی مشن کے منصوبے کے مطابق اقلیتوں کے تحفظ، قبائلی علاقوں کے انتظام اور بنیادی حقوق کی نوعیت اور حد پر مشورہ دینے کے لیے ایک مجلس مشاورت کا قیام ہونا تھا، چناں چہ جنوری ۱۹۴۷ء میں ۲۳ رکنی مجلس مشاورت بنائی گئی، بعد ازاں ان ہی میں سے فروری ۱۹۴۷ء میں بنیادی حقوق کی تشکیل کے لیے جے بی کرپلانی کی صدارت میں ۱۲ رکنی ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی، ذیلی کمیٹی نے بنیادی حقوق کا مسودہ تیار کیا اور کمیٹی کو اپریل ۱۹۴۷ء تک اپنی رپورٹ پیش کردی جسے بعد میں اسی کمیٹی نے اس کو اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا، جس پر ایک سال تک بحث اور گفت و شنید ہوتی رہی اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں مسودے کے بیشتر حصوں کو منظوری دے دی گئی، بنیادی حقوق کی تشکیل میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی جانب سے جاری کردہ انسانی حقوق کے عالمی منشور، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی سرگرمیوں اور امریکی آئین میں موجود حقوق بل کی تشریح میں امریکی عدالت عظمی کے فیصلوں کے اثرات موجود تھے، رہنما اصولوں کا مسودہ جسے بنیادی حقوق کے لیے قائم شدہ ذیلی کمیٹی کی جانب سے تیار کیا گیا تھا اس میں ہندوستان کی تحریک آزادی کی اشتراکی تعلیمات کو شامل کیا گیا، نیز وہ آئرستانی آئین کی رہنما اصولوں سے بھی متاثر ہیں، اور بنیادی فرائض کو ۱۹۷۶ء میں آئین کی بیالیسویں ترمیم میں شامل کیا گیا۔

بنیادی حقوق:

آئین ہند کے حصہ سوم میں مذکور بنیادی حقوق تمام ہندوستانیوں کو شہری حقوق کی ضمانت فراہم کرتے ہیں، اسی طرح ریاست کو فرد کی ذاتی آزادی میں مخل ہونے سے باز رکھتا ہے نیز شہریوں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ریاست پر عائد کرتا ہے، آئین میں اصلاً سات بنیادی حقوق فراہم کیے گئے تھے، مساوات کا حق، آزادی کا حق، غصب کے خلاف حق، مذہب، ثقافت اور تعلیم کی آزادی کا حق، جائداد کا حق اور آئینی چارہ جوئی

کا حق، تاہم جائداد کے حق کو ۱۹۷۸ء میں ۴۴ویں ترمیم کے ذریعہ آئین کے تیسرے حصہ سے ہٹادیا گیا۔

مذکورہ بالا بنیادی حقوق کا مقصد انفرادی آزادی اور ان جمہوری اصولوں کا تحفظ ہے جو معاشرے کے تمام افراد کی مساوات پر مبنی ہیں، دفعہ ۱۳ کے تحت یہ حقوق مقننہ اور عاملہ کے اختیارات کو محدود کرتے ہیں اور ان حقوق کی خلاف ورزی پر بھارت کی عدالت عظمی اور ریاستی عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایسی کسی قانون سازی یا عاملہ کی کاروائی کو غیر آئینی قرار دے سکیں، دفعہ ۱۲ میں مذکور تعریف کے مطابق یہ حقوق بڑے پیمانے پر ریاست کے خلاف قابل نفاذ ہیں، اور نہ صرف وفاقی اور ریاستی حکومتوں کی مقننہ اور عاملہ بل کہ مقامی انتظامی حکام اور عوامی کام کرنے والی یا سرکاری نوعیت کی دیگر ایجنسیوں اور اداروں کے خلاف بھی قابل نفاذ ہیں، تاہم کچھ حقوق مثلاً دفعات ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۴ میں مذکور حقوق نجی افراد کے خلاف بھی موجود ہیں، نیز کچھ بنیادی حقوق بشمول ان کے جو دفعات ۱۴، ۲۰، ۲۱، ۲۵ میں مذکور ہیں۔ بھارت کی سرزمین پر کسی بھی قومیت کے حامل اشخاص پر لاگو ہوتے ہیں جب کہ کچھ حقوق مثلاً جو دفعات ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۳۰ کے تحت موجود ہیں صرف ہندوستانی شہریوں کے لیے ہیں۔

بنیادی حقوق مطلق نہیں ہیں چناں چہ عوامی مفادات کے تحفظ کی خاطر ان پر مناسب پابندیاں بھی عائد کی جاسکتی ہیں، ۱۹۷۳ء میں کیشوانند بھارتی بمقابلہ کیرالا حکومت کے معاملے میں بھارت عدالت عظمی نے ۱۹۶۷ء کے اپنے سابقہ فیصلے کو منسوخ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ بنیادی حقوق میں ترمیم کی جاسکتی ہے، اگر اس طرح کی کسی ترمیم سے آئین کے بنیادی ڈھانچے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو عدالتی نظر ثانی کے تحت پارلیمنٹ کے ہر ایوان میں دو تہائی اکثریت سے منظور آئینی ترمیم کے ذریعہ بنیادی حقوق میں اضافہ یا حذف کیا جاسکتا ہے یا بصورت دیگر نظر ثانی کی جاسکتی ہے، ہنگامی صورت حال نافذ ہونے کی صورت میں دفعہ ۲۰ اور ۲۱ کو چھوڑ کر دیگر بنیادی حقوق میں سے کسی کو بھی

صدر جمہوریہ کے حکم سے عارضی طور پر معطل کیا جاسکتا ہے۔ نیز ایمرجنسی کے دوران میں صدر جمہوریہ کے حکم سے آئینی چارہ جوئی کے حقوق کو بھی معطل کیا جاسکتا ہے، نتیجتاً دفعہ ۲۰ اور ۲۱ کے سوا کسی بھی بنیادی حق کے نفاذ کے لیے شہریوں کی عدالت عظمی میں جانے پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، مزید پارلیمنٹ بھی دفعہ ۳۳ کے تحت قانون بنا کر شہریوں کے فرائض کی مناسب ادائیگی کو یقینی بنانے اور نظم وضبط کی بحالی کے لیے بھارتی مسلح افواج اور پولیس کے ارکان کے بنیادی حقوق کو محدود کرسکتی ہے۔

حق مساوات:

مساوات کا حق آئین کی اہم ضمانتوں میں سے ایک ہے، اس حق کا تذکرہ دفعہ ۱۴ تا ۱۶ میں موجود ہے، جن میں اجتماعی طور پر قانونی مساوات اور غیر امتیازی سلوک کے عام اصول شامل ہیں، اور دفعہ ۱۷ تا ۱۸ میں اجتماعی طور پر سماجی مساوات کا فلسفہ مذکور ہے، دفعہ ۱۴ قانونی مساوات کی ضمانت دیتا ہے اور ساتھ ہی بھارت کی سرحدوں کے اندر تمام افراد کو قانون کا یکساں تحفظ فراہم کرتا ہے، اس میں قانونی مقتدرہ کے سامنے تمام افراد کی مساوی ماتحتی اور یکساں حالات میں مساوی برتاؤ بھی شامل ہے، مؤخر الذکر دفعہ میں ریاست کو اس بات کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ وہ جائز مقاصد کے لیے افراد کی درجہ بندی کرسکتی ہے، بشرطیکہ اس کے لیے معقول بنیاد موجود ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ درجہ بندی میں من مانی نہ ہو اور درجہ بندی کئے جانے والے لوگوں میں ہونے والی تفریق ایک طریقہ کار پر مبنی ہو، نیز اس درجہ بندی سے مطلوبہ مقصد کا عقلی تعلق ہونا بھی ضروری ہے۔

دفعہ ۱۵ میں مذہب، نسل، ذات، جنس، جائے پیدائش یا ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر امتیازی سلوک کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے، جزوی یا کلی طور پر ریاستی سرمایے کے زیر انتظام چلنے والے عوامی تفریحی مقامات یا عوامی نزہت گاہوں میں مفت داخلے کے سلسلے میں یہ حق ریاست کے ساتھ ساتھ نجی افراد کے خلاف بھی قابل نفاذ ہے، تاہم

ریاست کو خواتین اور بچوں یا درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سمیت سماجی اور تعلیمی طور پر پسماندہ طبقوں کے شہریوں کے لیے خصوصی انتظام کرنے سے نہیں روکا گیا ہے، اس استثنا کی وجہ یہ ہے کہ اس دفعہ میں مذکور طبقوں کے لوگ محروم سمجھے جاتے ہیں اور انھیں خصوصی تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے، دفعہ ۱۶ میں عوامی روزگار کے مساوی مواقع فراہم کرنے کی ضمانت موجود ہے اور ریاست کو محض مذہب، نسل، ذات، جنس، جائے پیدائش، جائے سکونت یا ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک کرنے سے باز رہنے کی ہدایت دی گئی ہے، نیز اس دفعہ میں ریاست کو تمام پسماندہ طبقوں کے شہریوں کے عوامی خدمات میں مناسب نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے ان کے مفاد میں مثبت کارروائی کرنے کی رعایت دی گئی ہے، اسی طرح کسی مذہبی ادارے کے عہدے کو اس مذہب کی پیروی کرنے والے شخص کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، دفعہ ۱۷ میں چھوت چھات کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے، چناں چہ اس مقصد کے لیے قانون تحفظ شہری حقوق ۱۹۵۵ء پارلیمنٹ کی جانب سے نافذ کیا گیا ہے، دفعہ ۱۸ میں ریاست کو فوجی یا تعلیمی امتیازات کو چھوڑ کر کسی کو بھی القاب سے نوازنے سے منع کیا گیا ہے اور کوئی بھی ہندوستانی شہری کسی غیر ملکی ریاست سے کوئی لقب قبول نہیں کرسکتا، یوں بھارتی اشرافیہ کے القاب اور انگریزوں کے دئے گئے القاب کو ختم کردیا گیا ہے، تاہم عدالت عظمی نے بھارت رتن جیسے اعزاز کو اس بنیاد پر درست قرار دیا ہے کہ یہ اعزاز محض آرائشی ہیں اور وصول کنندہ اس اعزاز کو لقب کے طور پر استعمال نہیں کرسکتا۔

آزادی کا حق:

دستور سازوں نے حق آزادی کی اہمیت کے پیش نظر اس حق کو دفعہ ۱۹-۲۲ میں شامل کیا ہے اور ان دفعات میں کچھ پابندیاں بھی شامل کی ہیں جنھیں خصوصی حالات میں ریاست کی جانب سے انفرادی آزادی پر لاگو کیا جاسکتا ہے، دفعہ ۱۹ میں شہری حقوق کے تحت چھ آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے، تاہم یہ ضمانت محض ہندوستانی شہریوں کو حاصل

ہے، چھ قسم کی یہ آزادیاں حسب ذیل ہیں۔

۱-آزادیٔ اظہار رائے۔

۲-بدون ہتھیار اجتماع کی آزادی۔

۳-آزادیٔ تنظیم۔

۴-بھارت میں سفر کی آزادی۔

۵-بھارت کے کسی بھی خطے میں سکونت کی آزادی۔

۶-پیشہ، کاروبار یا تجارت کی آزادی۔

یہ تمام آزادیاں دفعہ ۱۹ میں مذکور ہیں اور کچھ مناسب پابندیوں کی تابع ہیں، جنھیں ریاست کی جانب سے ان پر نافذ کیا جاسکتا ہے، آزادی کی جس قسم کو محدود کرنا مقصود ہو اس کے مطابق پابندیوں کو نافذ کرنے کی بنیادیں مختلف ہوتی ہیں، ان میں قومی سلامتی، عوامی نظم ونسق، شرافت اور اخلاقیات، توہین عدالت، جرائم پر اکسانا اور بدنامی شامل ہیں، عوامی مفادات کی خاطر ریاست کو کسی تجارت، صنعت یا خدمت کو قومیانے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔

دفعہ ۱۹ میں مذکور آزادیوں کی ضمانت کو دفعہ ۲۰ تا ۲۲ کے ذریعہ بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ان شقوں کی توسیع اور خصوصاً مقررہ طریقہ کار کے اصول کے متعلق آئین ساز اسمبلی میں زبردست بحث ہوئی تھی، بحث کے دوران میں خاص طور پر بینیگل نرسنگ راؤ نے یہ دلیل دی کہ ایسی دفعہ کے نفاذ سے سماجی قانون سازی میں رکاوٹ آئے گی اور نظام کو برقرار رکھنے میں طریقہ کار کی مشکلات پیدا ہوں گی، اس لیے اسے مکمل طور پر آئین سے باہر ہی رکھا جائے، بالآخر آئین ساز اسمبلی نے ۱۹۴۸ء میں ''مقررہ طریقہ کار'' کے الفاظ ہٹا کر ان کی جگہ ''قانونی طور پر مقرر طریقہ کار'' کی تعبیر استعمال کی، نتیجتاً دفعہ ۲۱ جو ریاست کو کسی شخص کی زندگی یا ذاتی، آزادی میں مداخلت سے باز رکھتی ہے کہ مفہوم کو ۱۹۷۸ء تک عاملہ کی کارروائی تک محدود سمجھا گیا، تاہم ۱۹۷۸ء میں مینکا گاندھی بمقابلہ

بھارت یونین کے معاملے میں عدالت عظمی نے دفعہ ۲۱ کے تحفظ کو مقننہ کی کارروائی تک توسیع دیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ کسی کارروائی کا تعین کرنے والا قانون مناسب، منصفانہ اور منطقی ہونا چاہیے، اس معاملے میں عدالت عظمی نے یہ بھی کہا کہ دفعہ ۲۱ کے تحت ''زندگی'' کا مطلب محض ایک ''مخلوق کے وجود'' سے کہیں زیادہ ہے، اس میں انسانی وقار کے ساتھ جینے کا حق اور وہ تمام پہلو جو زندگی کو ''بامعنی، مکمل اور قابل زیست'' بناتے ہیں، شامل ہیں، اس کے بعد کی عدالتی تشریحات نے دفعہ ۲۱ کے اندر متعدد حقوق کو شامل کرتے ہوئے اس کے حدود میں توسیع کی، ان حقوق میں ذریعہ معاش، صاف ماحول، اچھی صحت، عدالتوں میں تیز رفتار سماعت اور بہ حالت قید انسانی رویہ کے استعمال سے متعلق حقوق شامل ہیں، نیز ۲۰۰۲ء کی چھیاسویں آئینی ترمیم میں دفعہ ۲۱ الف میں ابتدائی تعلیم کے حق کو بنیادی حق قرار دیا گیا۔ (ماخوذ)

اسلام اور جمہوریت

جمہوریت کا لفظ جمہور سے بنا ہے جو اکثر کے معنی میں ہے، اور جمہوریت سے اکثریتی رائے مراد لی جاتی ہے، جمہوری حکومت میں بھی کہیں نہ کہیں یہ معنی پنہاں ہیں، یعنی اس کی تشکیل میں بھی اکثریتی رائے کا اعتبار کیا جاتا ہے، ویسے اس کے اصطلاحی معنی ہیں ''عوام کی حکمرانی'' یعنی Rule of the people۔ حکمرانی کا یہ تصور یونان سے لیا گیا ہے، یونانی زبان میں اس طرز حکومت کو دو لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے Demo (عوام) Kratas (حکومت) کچھ لوگوں نے اسے ''اکثریت کی بات ماننا'' یا ''اکثریت کی اطاعت کرنا'' بھی کہا ہے، ایک یونانی مفکر ہیروڈوٹس (Herodotus) کہتا ہے کہ ''جمہوریت ایک ایسی حکومت کا نام ہے جس میں ریاست کے حاکمانہ اختیارات قانونی طور پر پورے معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں'' حالاں کہ بنیادی طور پر یہ تعریف صحیح نہیں ہے، جمہوریت میں حاکمانہ اختیارات ایسے طبقے کو حاصل ہوتے ہیں جس کو عوام اکثریتی رائے سے منتخب کرتے ہیں، میرے خیال سے سابق امریکی صدر ابراہام لنکن نے جمہوریت کی جو تعریف کی ہے وہ زیادہ قرین فہم ہے، Goverment of the people by the people for th people (عوام کی حکومت عوام کے ذریعے عوام پر)۔

بہ ہر حال عصر حاضر کا یہ ایک سیاسی نظام ہے اور اسے سب سے اچھا طرز حکومت تصور کیا جاتا ہے، کیوں کہ عوام کی اکثریت کی رائے سے حکومت بنتی اور ختم ہوتی ہے، اس نظام میں انفرادی آزادی اور شخصی مساوات کا تصور پایا جاتا ہے، اسی لیے اس طرز حکومت کی طرف لوگوں کا میلان زیادہ ہے، لفظ جمہور سے بعض لوگ دھوکا کھا گئے ہیں اور وہ اسے

اسلامی نظام سمجھنے لگے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ فقہی مسائل میں جمہور کی اصطلاح بہ کثرت استعمال ہوتی ہے، یعنی مصنف کہتا ہے اس مسئلے میں جمہور کی رائے یہ ہے، عموماً فقہاء اور علماء جمہور کی رائے ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اس نظام میں بھی اکثریت کی رائے قابل ترجیح ہوتی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے بعض فیصلے اکثریتی رائے پر کیے ہیں، جیسے غزوۂ احد کے موقع پر مدینہ سے باہر نکل کر جنگ لڑنے کا فیصلہ، اگر چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس کے مخالف تھی، لیکن آپ نے اکثریتی رائے کا اعتبار کیا، اس لیے اگر کوئی حکومت اکثریتی رائے سے وجود میں آتی ہے تو اسے تسلیم کرنا چاہیے۔

یہ خیال قطعی طور پر غلط ہے، جمہوری حکومت اور اسلامی حکومت میں بڑا فرق ہے، جمہوریت کی بنیاد عوام کی رائے پر ہوتی ہے، جب کہ اسلامی حکومت کی یہ تعریف کی جاتی ہے "اسلام میں اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعے اللہ کے جاننے والوں کے لیے" جمہوریت میں کہیں اللہ کا قانون نظر نہیں آتا، تمام قوانین وہ لوگ بناتے ہیں جن کو عوام اکثریتی رائے سے منتخب کرتے ہیں، اور وہی لوگ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ بھی کرتے ہیں، جمہوریت اور اسلامی طرز حکومت میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے، ایک خالصتاً انسانی قانون کے تابع ہے، اور دوسرا کلی طور پر احکام الٰہی کا پابند۔

جمہوریت کے تین عناصر ترکیبی ہیں: (۱) عوام کی بالاتری (۲) مساوات (۳) آزادی۔ ان تینوں عناصر کی کچھ تفصیل یہ ہے:

جمہوریت میں عوام ہی سب کچھ ہیں، ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہیں اقتدار پر بٹھا دیں، اور جس کو چاہیں اقتدار سے محروم کردیں، ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، گویا جمہوریت میں عوام ہی کو حکومت کرنے کے اختیارات حاصل ہوتا ہے، لیکن کیوں کہ عملاً ایسا ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جائیں، اور سب مل کر حکومت چلائیں، اس لیے وہ لوگ انتخاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو اپنا نمائندہ بناتے ہیں

اور انہیں اپنے اختیارات تفویض کر کے حکومت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں، عام طور پر جمہوری ملکوں میں جماعتیں قائم کرلی گئی ہیں، یہ جماعتیں انتخاب لڑتی ہیں، ان میں سے جس جماعت کے نمائندے زیادہ تعداد میں منتخب ہوتے ہیں وہ حکومت بناتی ہے، اور جس جماعت کے نمائندے کم تعداد میں منتخب ہوتے ہیں وہ اپوزیشن کا کردار ادا کرتی ہے، ہر نمائندہ اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر منتخب ہوتا ہے، خواہ اس کے حصے میں ایک ووٹ ہی کیوں نہ زائد آجائے، یہ لوگ حکومت میں پہنچ کر قانون سازی کرتے ہیں، پھر اپنے وضع کردہ قانون کو نافذ بھی کرتے ہیں، اسلام میں حکومت کا تصور خلافت الٰہیہ میں مضمر ہے، خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے، پھر خلیفۃ المسلمین کو وضع قانون کا کوئی اختیار نہیں ہے کیوں کہ وہ قانون الٰہی کا پابند ہے جو پہلے سے موجود ہے، البتہ وہ اسے نافذ کرنے کا مکمل حق رکھتا ہے۔

جمہوریت میں مساوات کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تمام لوگ شرف وفضیلت، عزت واحترام اور حقوق کے اعتبار سے یکساں ہیں، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگ قانون کی نظر میں یکساں ہیں، ان میں کسی طرح کی کوئی تفریق نہیں ہوسکتی، اسی طرح ہر شخص کو معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی کے یکساں مواقع میسر ہیں، اب یہ اس کی صلاحیت اور اہلیت پر منحصر ہے کہ وہ ان مواقع کو کس طرح استعمال کرتا ہے، اور کس طرح آگے بڑھتا ہے، اسلام میں مساوات کا یہ تصور اس کے مکمل مفہوم کے ساتھ موجود ہے، بل کہ عملی طور پر اگر کسی مذہب نے اس تصور کو حقیقت کا روپ دیا ہے تو وہ اسلام ہے، جمہوریت میں تو کچھ لوگ منصب اور قانون کا سہارا لے کر مساوات کے اس مفہوم کو متاثر کرسکتے ہیں لیکن اسلام میں اس طرح کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

آزادی کو جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے، اس میں عقیدہ ومذہب کی آزادی، تحریر وتقریر کی آزادی، فکر وخیال کی آزادی، ہر طرح کی آزادی شامل ہے، چناں چہ جمہوریت میں ہر شخص کو اپنے اصول ونظریات کے مطابق اپنے مذہبی رسوم ورواج پر چلنے اور اپنے

مذہب وثقافت اور کلچر کو فروغ دینے کا حق حاصل ہے، وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی طرح کا ذریعۂ معاش اختیار کرسکتا ہے، اسے قانون کے دائرے میں رہ کر اپنی ملکیت میں اضافہ کرنے اور اپنی جائداد بڑھانے کا مکمل حق ہے، وہ جماعت بھی بنا سکتا ہے، انتخاب میں بھی حصہ لے سکتا ہے، حکومت پر بھی تنقید کرسکتا ہے، اسلام بھی آزادی کا قائل ہے، مگر اس نے کسی بھی فرد کو مطلق آزاد نہیں چھوڑا، آزادی چاہے فکروخیال کی ہو، تجارت ومعیشت کی ہو، ثقافت وکلچر ہو، عقیدہ ومذہب کی ہو، اسلام میں ہر آزادی حدود وقیود کے دائرے میں ہے، جمہوریت کی طرح بے لگام آزادی کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔

علامہ اقبالؒ جمہوریت کے شدید مخالف تھے، انھوں نے اپنی نظم ونثر دونوں میں اس تصور حکومت کی نفی کی ہے، مشہور نظم ''خضر راہ'' میں علامہ اقبالؒ کے یہ خیالات موجود ہیں، ان کا خیال ہے کہ جمہوریت دراصل سرمایہ داروں کے ذہن کی پیداوار ہے تاکہ وہ انفرادی آزادی کے جمہوری تصور کے پردے میں کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی تجارت کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کر کے خوب عیش کریں۔

اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ جمہوریت ملوکیت ہی کی تبدیل شدہ صورت ہے، اس کا ظاہر بلاشبہ خوب صورت اور دلکش ہے مگر اس کا اندورن بڑا تاریک ہے، اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں علامہ اقبالؒ نے جمہوریت کے اسی تاریک پہلو پر روشنی ڈالا ہے، وہ جمہوریت کو احمقوں کی حکومت کہتے تھے کیوں کہ اس میں ایک جاہل اور عالم دونوں انتخاب حکومت میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

جمہوریت میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، اسی لیے بہت سے اہل علم اور ارباب سیاست نے جمہوریت پر تنقید بھی کی ہے اور اس کے بعض اصولوں کو غلط بتلایا ہے، صرف اسلام ہی ایک ایسا نظام حکومت پیش کرتا ہے جو جمہوریت کی خوبیوں سے آراستہ اور اس کی خامیوں سے مبرّا ہے۔

آئینہ افکار
سیاسی زندگی
ہماری زندگی
ہمارے مدارس
مزاج اور منہاج
DARUL KITAB
DEOBAND DIST SAHARANPUR U.P (INDIA)